سورۂ رعد

ایاتھا ۴۳ ۱۳ سورۃ الرعد مدنیۃ ۹۶ رکوعاتھا ۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت حسن، عکرمہ، عطا اور حضرت جابر کے قول کے مطابق یہ مکی ہے جبکہ کلبی اور مقاتل کے نزدیک مدنی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت قتادہ کا ارشاد ہے: سوائے دو آیتوں کے جو مکے میں نازل ہوئیں باقی ساری سورت مدنی ہے اور وہ وَلَوۡ اَنَّ قُرۡاٰنًا سُیِّرَتۡ بِہِ الۡجِبَالُ سے لے کر آخر تک دو آیتیں ہیں۔

الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝

''الف۔ لام۔ میم۔ را۔ یہ آیتیں ہیں کتاب (الٰہی) کی اور جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے، وہ حق ہے لیکن اکثر لوگ (اپنی کج فہمی کے باعث) ایمان نہیں لاتے''۔

قولہ تعالیٰ: الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ اس کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ یعنی یہ قران جو آپ پر اتارا گیا ہے مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ تیرے رب کی جانب سے حق ہے نہ کہ جس طرح مشرک کہتے ہیں کہ آپ اپنی طرف سے اسے پیش کرتے ہیں، سو اسے مضبوطی سے پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرو۔ مقاتل نے کہا: یہ آیت تب نازل ہوئی جب مشرکین نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قران اپنی طرف سے پیش کرتے ہیں۔ وَ الَّذِیۡۤ، اٰیٰتُ پر عطف کی وجہ سے محل رفع میں ہے یا مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور الۡحَقُّ اس کی خبر ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محل جر میں ہو اور تقدیر عبادت یوں ہو: وآیات الذی أنزل الیک اور الۡحَقُّ کا رفع مبتدا کے مضمر ہونے کی بنیاد پر ہوگا، تقدیر عبارت: ذالك الحقُّ ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَهُمْ يَعْلَمُونَ الحقُّ یعنی ذالك الحقُّ فراء نے کہا: اور اگر آپ چاہیں تو وَ الَّذِیۡۤ کو الۡکِتٰبِ کی صفت بنا کر مجرور پڑھ لیں، اگرچہ اس میں واو بھی ہے جس طرح کہا جاتا ہے: آتانا هذا الكتاب عن ابی حفص و فاروق۔ اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

إلى الملِكِ القَرمِ وابن الهُمامِ وليثِ الكتيبةِ في المُزدَحَم (1)

اس سے مراد إلى الملك القرم بن الهمام، ليث الكتيبه ہے۔

وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ وَ سَخَّرَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 111

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى ۚ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ ۝

''اللہ وہ (قدرت وحکمت والا ہے) جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستونوں کے (جیسے) تم انہیں دیکھ رہے ہو پھر وہ متمکن ہوا عرش پر اور پابند حکم بنادیا سورج اور چاند کو، ہر ایک رواں ہے مقررہ میعاد تک، اللہ تعالیٰ تدبیر فرماتا ہے ہر کام کی کھول کر بیان کرتا ہے (اپنی) نشانیوں کو شاید تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرلو''۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ قرآن حق ہے، تو یہ بھی بیان فرمایا کہ اس کو نازل کرنے والا کمال پر قدرت رکھتا ہے، اس کی کاریگریوں کو دیکھو تا کہ اس کی قدرت کے کمال کو پہچان سکو۔ یہ معنی پہلے گزر چکا ہے۔ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا کے ارشاد کے متعلق دو قول ہیں: ایک یہ کہ بغیر ستونوں کے بلند ہیں جیسے تم دیکھ رہے ہو، یہ حضرت قتادہ، ایاس بن معاویہ اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے ستون ہیں لیکن ہم وہ دکھاتے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آسمان کے ستون قاف پہاڑ پر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس پر یہ بات کی جائے کہ ستون اس کی وہ قدرت ہے جس کے ذریعے وہ آسمان اور زمین کو روکتا ہے۔ اور وہ قدرت ہمیں نظر نہیں آتی، زجاج نے اس بات کو ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا کہ جب کافر کے کفر سے آسمان پھٹنے کے قریب ہو گیا تو مومن کی توحید آسمان بن گئی، اس کو غزنوی نے ذکر کیا ہے عمد، عمود کی جمع ہے۔ نابغہ نے کہا ہے:

وَخَيِّسِ الجِنَّ إِنِّي قَدْ أَذِنْتُ لَهُمْ يَبْنُونَ تَدْمُرَ بِالصُّفَّاحِ وَالعَمَدِ(1)

اس میں العمد عمود کی جمع ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اس کے بارے میں گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ یعنی ان دونوں کو اپنی مخلوق کے منافع اور اپنے بندوں کے مصالح کے لیے مسخر فرمایا اور ہر مخلوق اپنے خالق کی تابعدار ہے۔ كُلٌّ يَجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی معلوم وقت تک اور وہ دنیا کی فنا کا ہے اور اس وقت کے قیام کا ہے جس وقت سورج کو لپیٹ دیا جائے گا، چاند کو گرہن لگ جائے گا، ستارے محو ہو جائیں گے اور کواکب اُڑ جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: لِاَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد ان دونوں کے وہ درجات اور منازل ہیں جہاں ان کی انتہا ہوئی ہے اور ان مقامات سے آگے تجاوز نہیں کر سکتے۔ ایک قول کے مطابق لِاَجَلٍ مُّسَمًّى کا معنی یہ ہے کہ چاند مہینے میں اپنے فلک کو طے کرتا ہے اور سورج سال میں۔ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف فرماتا ہے يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ یعنی ان کو بیان فرماتا ہے مراد یہ ہے کو جو ان امور پر قدرت رکھتا ہے وہ ان کو دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہوگا، اسی وجہ سے فرمایا: لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ شاید تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرلو۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 112

وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ③

"اور وہی ہے جس نے پھیلا دیا زمین کو اور بنا دیئے اس میں پہاڑ اور دریا اور ہر قسم کے پھلوں میں سے دو دو جوڑے بنا دیئے وہ ڈھانپ دیتا ہے رات سے دن کو، بے شک ان تمام چیزوں میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ جب آسمان کی نشانیوں کو بیان فرما دیا تو اب زمین کی نشانیوں کو بیان فرمایا یعنی زمین کو طول و عرض میں پھیلا دیا۔

وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ یعنی ایسے پہاڑ جو بہت زیادہ ثابت ہیں، اس کا واحد راسیۃ ہے کیونکہ زمین ان کے ذریعے ثابت رہتی ہے اور الارساء کا معنی الثبوت ہے۔ عنترہ نے کہا ہے:

فَصَبَرْتُ عَارِفَةً لذالك حُرَّةً   تَرْسُو اِذَا نَفْسُ الجَبَانِ تَطَلَّعُ

جمیل نے کہا:

اُحِبُّهَا والذی اَرْسٰی قواعِدَهٗ   حُبًّا اِذَا ظَهَرَتْ اٰیاتُهٗ بَطَنَا

ان دونوں اشعار میں ترسو اور ارسی کا یہی معنی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطا نے کہا: زمین پر قائم ہونے والا پہلا پہاڑ ابو قبیس ہے۔

مسئلہ۔ ان آیات میں ان لوگوں کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ زمین ایک کرہ ہے، اسی طرح ان کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ زمین کے دروازے اس پر جھکتے ہیں۔ ابن راوندی کا خیال ہے کہ زمین کے نیچے بہت زیادہ بلند ہونے والے اجسام ہیں جس طرح کہ اوپر اٹھنے والی ہوا ہوتی ہے۔ اور یہ ڈھلوان ہے تو قوت اور مدار میں نیچے آنے والی زمین اوپر اٹھنے والے اجسام معتدل ہو جاتے ہیں تو اس طرح ان دونوں میں موافقت پیدا ہو جاتی ہے، جبکہ دیگر لوگوں کا گمان یہ ہے کہ زمین دو جسموں سے مرکب ہے ایک نیچے آنے والا ہے اور دوسرا اوپر اٹھنے والا، دونوں میں اعتدال آیا تو اس وجہ سے زمین ٹھہر گئی، جبکہ مسلمان اور اہل کتاب کا عقیدہ زمین کے وقوف، اس کے ساکن ہونے اور اس کے پھیلنے کا ہے اور اس کی حرکت عام طور پر زلزلہ کے ذریعے ہوتی ہے جو (بعض اوقات) اس میں بپا ہوتا ہے۔ وَ اَنْهٰرًا یعنی زمین پر جاری پانی، اس میں مخلوق کا فائدہ اور منافع ہے۔ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ۔ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ، بمعنی صنفین ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: الزوج واحد ہے اور جوڑتے دو ہیں۔ فراء نے کہا: الزوجین سے یہاں مراد مذکر اور مؤنث ہے لیکن یہ نص کے خلاف ہے۔ ایک قول ہے: زَوْجَيْنِ کا معنی نوعین ہے جس طرح کہ میٹھا اور کڑوا، خشک اور تر، سفید اور سیاہ، چھوٹا اور بڑا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ یعنی دلالت اور علامات لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ اس قوم کے لیے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔

وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ

صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۙ وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

''اور زمین میں (مختلف قسم کے) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں اور باغات ہیں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں کچھ ایک تنے سے پھوٹی ہیں اور کچھ الگ الگ تنوں سے، سیراب کیا جاتا ہے ایک ہی پانی سے (اس کے باوجود) ہم فضیلت دیتے ہیں بعض (درختوں) کو بعض پر ذائقہ اور بو میں، بے شک ان میں (اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو عقلمند ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کلام میں فرق ہے: معنی ہوگا: وفی الأرض قطع متجاورات وغیر متجاورت جس طرح فرمایا: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ (النحل: 81) جبکہ مطلب ہے سرابیل تقیکم الحر و تقیکم البرد پھر وغیر متجاورات کو سامع کے علم کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ المتجاورات سے مراد شہر اور وہ علاقے ہیں جو آباد ہوں اور غیر متجاورات سے مراد صحراء اور غیر آباد علاقے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مُّتَجٰوِرٰتٌ سے مراد قریب قریب کے شہر ہیں، ان کی مٹی ایک ہے، ان کا پانی ایک ہے، ان میں کھیتیاں اور باغات ہیں لیکن پھلوں اور کھجوروں میں واضح فرق ہے۔ بعض پھل میٹھے ہوتے ہیں جبکہ بعض تُرش؛ بعض درخت کی ایک ٹہنی کا پھل چھوٹا، بڑا ہونے میں رنگ و ذائقہ میں مختلف ہوجاتا ہے اور ان تمام پر سورج و چاند کا پھیلاؤ ایک ہی نظم و نسق کے مطابق ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی بے نیازی پر بہت بڑی دلیل ہے اور ایسے آدمی کے لیے بڑی نصیحت ہے جو اس کی معرفت سے گمراہی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ کے ذریعے اس بات پر آگاہ فرمایا کہ یہ سب کچھ اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور وہ ذات اپنی قدرت پر عمل فرمانے والی ہے۔ یہ طبیعت کے قول کے بطلان کی بہت بڑی دلیل ہے؛ کیونکہ اگر یہ سب کچھ پانی اور مٹی کے ذریعے ہوتا اور اس کا فاعل طبیعت ہوتو پھر اختلاف وقوع پذیر نہ ہوتا۔ ایک قول یہ ہے کہ استدلال کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ٹکڑوں کے درمیان فرق کو ثابت فرمایا۔ مٹی کے ایک ٹکڑے سے میٹھی چیز پیدا ہورہی ہے اور دوسرے سے تُرش حالانکہ وہ بالکل ایک دوسرے کے قریب ہے۔ یہ بھی اس کی قدرت کے کمال کی دلیلیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ظالموں اور منکروں کی کہی ہوئی باتوں سے بلند تر ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ کفار لعنۃ اللہ علیہم کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر حادث چیز خود بخود پیدا ہوجاتی ہے اس کا کوئی صانع اور بنانے والا نہیں ہوتا اس پر درختوں سے پیدا ہونے والے پھلوں کو بطور استشہاد انہوں نے پیش کیا ہے۔ انہوں نے ان کے پیدا ہونے کا اقرار جبکہ پیدا کرنے والے کا انکار کردیا، اسی طرح اعراض کا انہوں نے انکار کیا ہے۔ ایک گروہ نے کہا: پھل بغیر صانع کے پیدا ہوتا ہے، اور اعراض کا فاعل ہوتا ہے، اور حادث کے لیے کسی محدث کے ضروری ہونے پر دلیل یہ ہے کہ وہ ایک وقت میں اسے پیدا کرتا ہے اور جو چیز اس کی ہم جنس ہے اسے دوسرے وقت میں پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کے ساتھ

اختصاص کی وجہ سے اس کے وقت میں اس کا حدوث ہوتا تو ضروری تھا کہ ہر وہ چیز جو اس کی ہم جنس ہے وہ اس کے وقت میں ہی پیدا ہوتی۔ جب اس کے وقت کے ساتھ اس کا اختصاص باطل ہے تو اس کے ساتھ اس کا اختصاص صحیح ہوگا اس مخصص کی وجہ سے جس نے اس کے ساتھ خاص کیا ہے، اگر اس کی تخصیص اس کے ساتھ نہ ہو تو اس کا حدوث اس کے وقت میں، اس کے وقت سے پہلے یا بعد اس کے حدوث سے اولی نہ ہو۔ اور اس کی تفصیل علم کلام میں ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ حضرت حسن نے وَّجَنّٰتٌ تا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی: وجعل فیھا جنات یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ (فصلت: 10) پر محمول ہے۔ اور کل پر محمول کرتے ہوئے اس کا مجرور ہونا بھی صحیح ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: ومن کل الثمرات ومن جنات باقی قراء نے جَنّٰتٌ پڑھا ہے تقدیر عبارت ہوگی: وبینھما جنات، وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ وابن کثیر، ابو عمرو اور حفص نے جنات پر عطف کرتے ہوئے ان کو مرفوع پڑھا ہے یعنی وفی الأرضِ ذرعٌ ونخیلٌ اور باقی قراء نے اَعْنَابٍ پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ تو کھیتی اور کھجور باغوں میں سے ہی ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وَّجَنّٰتٌ کی طرح کل پر ان کا عطف کیا جائے۔ مجاہد اور سلمی وغیرہ نے صُنوان صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ۔ یہ دونوں لغتیں ہیں یہ دونوں "صنو" کی جمع ہیں اور یہ کھجور کے بہت سے درخت ہیں یا دو درخت ہیں۔ ان کی ایک ہی اصل ہوتی ہے اس سے کئی سرے نکلتے ہیں تو وہ کھجور کئی درخت بن جاتے ہیں۔ اس کی مثال قِنوان ہے جس کا واحد قِنو ہے۔ ابو اسحاق نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ صِنوان سے مراد جھنڈ ہے (1) اور غیر الصنوان سے مراد متفرق درخت ہیں۔ نحاس نے کہا: لغت میں یہ اس طرح ہے کہ جب اس میں کوئی اور کھجور کا درخت ہو یا زیادہ درخت ہوں تو صنوان کہا جاتا ہے اور الصّنو سے مراد مثل ہے اسی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: عَمُّ الرجُلِ صِنوُابیه ہے یعنی آدمی کا چچا اس کے باپ کی مثل ہے۔

اس میں تثنیہ اور جمع کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ شاعر نے کہا:

العلمُ والحلمُ خُلّتاً کَرَمٍ للمرءِ زَینٌ إذاهُمَا اجْتَمَعاَ

صِنْوانِ لایُستَتَمُّ حُسْنُهُمَا اِلاَّ بجمعٍ ذا وذاكَ مَعاَ

شعر میں صنوان تثنیہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ جس طرح کہ بنی آدم کے نیک اور خبیث سب کا باپ ایک ہے۔ یہ نحاس اور بخاری کا قول ہے۔ عاصم اور ابن عامر نے یُسقٰی، یاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اس سب کچھ کو سیراب کیا جاتا ہے، جبکہ باقیوں نے جَنّٰتٌ کی وجہ سے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو حاتم اور ابو عبیدہ نے اس کو اختیار کیا ہے۔ ابو عمرو نے کہا ہے کہ تانیث بہتر ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ فرمایا ہے بعضہ نہیں فرمایا۔ حمزہ اور کسائی نے یُدبرالامرِ یُفصِلُ اور یُغشِی کا قیاس کرتے ہوئے یُفَضِّلُ پڑھا ہے اور باقیوں نے نُفَضِّلُ نون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 119

نحنُ نفصّلُ حضرت جابر بن عبد اللہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت محمد ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: ''لوگ مختلف درختوں سے ہیں، میں اور آپ ایک درخت سے ہیں''۔ پھر حضرت محمد ﷺ نے وَ فِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ کی یُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ تک تلاوت فرمائی۔ اور الْاُكُلِ سے مراد پھل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد میٹھا، ترش، فارسی اور ردی کھجور ہے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وَ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ کے بارے میں فرمایا: الفارسی والدقل والحلو والحامض (2) اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: اس آیت سے مراد ضرب المثل ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کے لیے ضرب المثل بیان فرمائی ہے کہ ان کی اصل ایک ہے جبکہ یہ بھلائی، برائی، ایمان اور کفر میں اس طرح مختلف ہیں جس طرح ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پھل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی سے شاعر کا قول ہے:

النّاسُ کالنّبتِ والنّبتُ ألوان منها شجرالصّندلِ والکافورِ والبان

ومنها شجرٌ ینضحُ طول الدّھرِ قطران

اس شعر میں اسی حقیقت کا اظہار ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ یعنی ایسے آدمی کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھنے والا دل رکھتا ہے۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اے سننے والے! اگر تو (ان کے تعصب پر) حیران ہوتا ہے تو حیرت انگیز ان کا یہ قول بھی ہے کہ کیا جب ہم (مرکر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کیا جائے گا، یہی (منکرین قیامت) وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا اور انہیں (بدنصیبوں) کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس (آگ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں''۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ یعنی اے محمد ﷺ! اگر آپ ان کے اس رویے پر حیران ہیں (3) کہ آپ کو صادق و امین تسلیم کرنے کے بعد انہوں نے آپ کی تکذیب کی تو ان کا بعث بعد الموت کی تکذیب کرنا اس سے زیادہ حیران کن ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حیران نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے حیران ہونا چاہیے، کیونکہ تعجب تو اسباب مخفیہ کی وجہ سے نفس کی تبدیلی کو کہتے ہیں (اور اللہ تعالیٰ تو اس سے منزہ و مبرا ہے)، یہاں صرف اس لیے ذکر فرمایا ہے تاکہ اس سے اللہ کا نبی اور مومنین حیران ہوں۔ ایک قول کے مطابق معنی یہ ہے: اے محمد ﷺ! اگر آپ اس بات سے حیران ہیں کہ یہ مجھے آسمانوں، زمین

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 124
2۔ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 140
3۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 95

اور ایک زمین سے مختلف پھلوں کا خالق مانتے ہیں اور بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں تو ان کی یہ گفتگو حیران کن ہے جس سے ساری مخلوق حیران ہے کیونکہ اعادہ اور بعث بعد الموت ابتدا ہی کی طرح ہے۔ ایک قول کے مطابق: آیت صانع کے منکرین کے بارے میں ہے، یعنی اگر آپ اتنے واضح دلائل کے باوجود ان کے صانع کے انکار سے حیران ہیں کیونکہ متغیر کے لیے کسی تبدیل کرنے والے کا ہونا ضروری ہوتا ہے تو یہ بات (واقعتا) محل تعجب ہے۔ اور نظم آیت پہلے اور دوسرے دونوں معنوں پر دلالت کرتی ہے، ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ یعنی جب ہم مٹی ہو چکے ہوں گے تو ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا؟

اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اس کو اِنا بھی پڑھا گیا ہے۔ والاَغْلٰلُ، غُلٌ کی جمع ہے اس سے مراد ایسا طوق ہے جس کے ساتھ ہاتھ سے گردن تک باندھ دیا جاتا ہے یعنی قیامت کے دن باندھ دیے جائیں گے اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ۔۔۔۔۔ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝ (غافر) تک ہے۔ ایک قول کے مطابق اغلال سے مراد ان کے وہ برے اعمال ہیں جو انہیں لازم ہیں۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

"اور یہ تیزی سے مطالبہ کرتے ہیں آپ سے برائی (عذاب) کا نیکی (بخشش) سے پہلے اور (ان نادانوں کو یاد نہیں کہ) گزر چکے ہیں ان سے پہلے نزول عذاب کے کئی واقعات اور (اے محبوب) بلاشبہ آپ کا رب بہت بخشنے والا (بھی) ہے لوگوں کے لیے ان کے ظلم (زیادتی) کے باوجود اور بے شک آپ کا رب سخت عذاب دینے والا (بھی) ہے اور کافر کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئی ان کی طرف کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے آپ تو (کجروی کے انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے آپ ہادی ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ یعنی اپنے انکار اور تکذیب کی زیادتی کی وجہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ان کا یہ قول ہے: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ (الانفال: 32) یا اللہ! اگر تیری طرف سے یہی حق ہے تو ہمارے اوپر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا۔ حضرت قتادہ نے کہا: انہوں نے معافی سے پہلے سزا کا مطالبہ کیا ہے (1)، جبکہ پروردگار عالم نے اس امت سے سزا کو قیامت تک مؤخر کرنے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: قَبْلَ الْحَسَنَةِ سے مراد قبل الایمان ہے جس کی وجہ سے امان اور نیکیوں کی امید ہوتی ہے۔ الْمَثُلٰتُ سے مراد عقوبات ہیں (2)، اس کا واحد مَثُلَة ہے۔ اعمش سے روایت ہے کہ اس نے الْمُثْلَات میم کے ضمہ اور ثا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مُثْلَة کی جمع ہے اور المثلات بھی صحیح ہے یعنی ضمہ کے ثقیل ہونے

1۔ تفسیر طبری، سورۂ رعد، جلد 13، صفحہ 127
2۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 94-95

کی وجہ سے ضمہ کو فتحہ سے تبدیل کر دیا جائے۔ ایک قول یہ ہے: حا کے عوض فتحہ کو لایا جاتا ہے۔ اُعمش سے یہ بھی روایت ہے کہ اس نے المَثْلاتُ میم کے فتحہ اور ثا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو یہ مَثْلَہ کی جمع ہے پھر ضمہ کے ثقل کے باعث ضمہ کو حذف کر دیا گیا۔ نحاس رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سب کچھ بیان کیا ہے۔ جماعت کی قرأت کے مطابق اس کا واحد مَثُلَہ ہے جیسے صَدُقَہ اور بنو تمیم ثا اور میم دونوں کو ضمہ دیتے ہیں، ان کی لغت کے مطابق اس کا واحد مُثْلَہ یعنی میم کے ضمہ اور ثا کی جزم کے ساتھ ہے؛ جیسے غُرْفَۃ اور غُرُفات۔ اور اس سے فعل مَثَلْتُ، اَمْثُلُ، مثلاً میم کے فتحہ اور ثا کے سکون کے ساتھ آتا ہے۔ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ یعنی مشرکین (1) کے ایمان لانے کی صورت میں ان سے درگزر کرنے والا اور گناہگاروں کی توجہ کی صورت میں انہیں معاف فرمانے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی آیت وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ سے امید رکھتا ہوں۔ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ جب وہ کفر پر اصرار کرتے ہیں تو تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے عن سعید بن مسیب بیان کیا ہے کہ آپ نے کہا: جب وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اللہ کی معافی، رحمت اور درگزر کا سلسلہ نہ ہوتا تو کسی کی زندگی پر سکون نہ ہوتی اور اگر اس کی سزا، وعید اور عذاب نہ ہوتا تو ہر ایک توکل کر لیتا'' (2)۔ وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا یعنی ھلا، اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ جب انہوں نے آیات کی خواہش کی اور ان کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ، منذر کا معنی معلم ہے۔ وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ یعنی ایسا نبی جو ان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے (3)۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد ہے الھادی اللہ (4)۔ یعنی آپ پر انذار لازم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہے تو اللہ ہر قوم کا ہادی ہے۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۞ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۞

''اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو (شکم میں) اٹھائے ہوتی ہے کوئی مادہ اور (جانتا ہے) جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ چیز کو اور ہر ظاہر چیز کو سب سے بڑا اعالی مرتبہ ہے''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى۔ یعنی بچہ، بچی، عمدہ، قبیح، نیک اور نافرمان میں سے اور سورۃ انعام میں گزر چکا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ علم غیب میں منفرد ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور ہم نے وہاں امام بخاری کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بھی ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''غیب کی چابیاں پانچ ہیں'' (5)۔ الحدیث اور اس

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 235　2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 514　3۔ مصنف عبد الرزاق، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 229
4۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 235　5۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 681

میں یہ بھی ہے کہ ''جو رحم کم کرتے ہیں اسے سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا'' (1)۔

وَمَا تَغِيضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: یعنی یہ ہے کہ جو نو ماہ سے پہلے بچہ گرا دیتی ہیں اور جو نو ماہ سے زیادہ عرصے میں جنتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مجاہد نے کہا: جب عورت حالت حمل میں حائضہ ہو جاتی ہے (2) تو یہ اس کے بچے کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے اور اگر حیض چھ دن سے زیادہ ہو جائے تو جو نقصان ہو چکا ہوتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ مجاہد سے ہی روایت ہے: الغيض سے مراد ہے'' خون میں سے جو رحم کم کر دیتے ہیں'' اور زیادتی سے مراد جو ان سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق: کمی اور زیادتی دونوں بچے کی طرف راجع ہوتی ہیں جس طرح مثلاً ایک انگلی یا کسی اور عضو کا کم ہو جانا یا انگلی یا کسی عضو کا زیادہ ہو جانا۔ ایک قول یہ بھی ہے: الغیض سے مراد حیض کے خون کا ختم ہونا ہے اور وَمَا تَزْدَادُ سے مراد وضع حمل کے بعد نفاس کا خون ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ حاملہ کو حیض آسکتا ہے یہ امام مالک اور ایک قول کے مطابق امام شافعی کا بھی قول ہے۔ عطا، شعبی اور دیگر کا قول ہے کہ اسے حیض نہیں آسکتا۔ یہی امام (اعظم) ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے آپ کی دلیل یہی آیت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تاویل کے بارے میں فرمایا: یہ حمل کا حیض ہوتا ہے، عکرمہ اور مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے اور یہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے اور جب حاملہ عورتوں کو حیض آ جاتا تو آپ ان کو ترک نماز کا فتویٰ دیتی تھیں، اور اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کثرت سے موجود تھے کسی نے بھی آپ کی اس بات کا انکار نہیں کیا تو گویا اس پر سب کا اجماع ہو گیا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابن قصار نے کہا ہے: ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دو آدمیوں کا بچے کے بارے میں تنازعہ ہو گیا، تو وہ کیس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے یہ کیس قیافہ شناسوں کے سامنے پیش کر دیا۔ قیافہ شناسوں نے وہ بچہ ان کے ساتھ ملایا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دودھ کی زیادتی کے سبب اس کا فیصلہ فرمایا اور قریشی عورتوں سے آپ نے پوچھا آپ نے فرمایا: دیکھو اس بچے کی کیا صورت حال ہے؟ انہوں نے کہا: پہلے شوہر نے اس کے ساتھ خلوت کی اور اسے فارغ کر دیا تو حالت حمل میں اسے حیض آ گیا اس نے یہ سوچا کہ شاید اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ تو دوسرے مرد نے اس کے ساتھ دخول کیا بچہ دوسرے کے پانی کے ذریعے پروان چڑھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ اکبر! اور بچے کو پہلے مرد کے حوالے کر دیا اور یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ حاملہ کو حیض نہیں آتا اور نہ صحابہ میں سے کسی نے کہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس پر اجماع ہے۔ واللہ اعلم۔ مخالف کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ حاملہ کو حیض آسکتا ہے اور حاملہ عورت جو خون دیکھے گی وہ حیض ہو گا تو پھر حیض کے ذریعے استبرا صحیح نہیں ہو گا حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ حیض کے ذریعے استبرا ہو جاتا ہے۔ امام مالک سے امام محمد کی کتاب میں ایک روایت ہے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ حیض نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ حاملہ بعض اوقات نو ماہ سے کم یا زیادہ مدت میں بھی وضع حمل کرتی ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے۔ عبد الملک بن مروان چھ ماہ کی مدت میں پیدا ہوا تھا۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 681 2۔ مصنف عبد الرزاق، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 230

مسئلہ نمبر 4۔ یہ چھ ماہ چاند کے اعتبار سے ہوں گے جس طرح کہ سارے شرعی مہینے۔

اسی وجہ سے امام مالک کے بعض اصحاب سے مذہب کے بارے میں روایت ہے، میرا (قرطبی) خیال ہے ابن حارث کی کتاب میں ہے کہ اگر وہ چھ ماہ سے تین دن کم ہوا تو بچہ مہینوں کی کمی یا زیادتی کی علت کے سبب کسی کے ساتھ ملحق ہوگا اس کو ابن عطیہ نے بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ حمل کی اکثر مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن جریج نے جمیلہ بنت سعد سے عن عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: حمل تکلہ کے سائے کے پھرنے کی مقدار بھی دو سال سے زیادہ نہیں ہوگا، اس کو دار قطنی نے ذکر کیا ہے جمیلہ بنت سعد، عبید بن سعد کی بہن نے لیث بن سعد سے بیان کیا(1): اس کی زیادہ سے زیادہ مدت تین سال ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے چار سال مروی ہے۔ امام مالک سے ایک روایت کے مطابق اور یہی مشہور ہے پانچ سال کی مدت منقول ہے۔ آپ سے ایک روایت مالا نہایۃ کی بھی ہے اگرچہ وہ مدت دس سال سے بھی زائد کیوں نہ ہو جائے۔ آپ سے یہ تیسری روایت ہے۔ زہری سے چھ اور سات سال مروی ہیں۔ ابو عمر نے کہا: صحابہ کرام میں سے کسی نے اس کی مدت سات سال کہی ہے۔ امام شافعی سے کئی مدتیں منقول ہیں۔ جن میں سے آخری چار سال ہے۔ کوفی (یعنی احناف) کہتے ہیں: دو سال ہے اس سے زیادہ نہیں۔ محمد بن عبد الحکیم کہتے ہیں: ایک سال ہے اس سے زیادہ نہیں۔ داؤد کہتے ہیں: نو ماہ ہے، ان کے نزدیک حمل اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ ابو عمر نے کہا: یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی سوائے اجتہاد کے اور عورتوں کے معروف معاملات کی طرف لوٹنے کے کوئی اصل نہیں و باللہ التوفیق۔ دار قطنی نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت مالک بن انس کو کہا(2) کہ مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے حدیث بیان کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''حمل تکلہ کے سائے کے پھرنے کی مقدار بھی دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا'' تو آپ نے کہا: سبحان اللہ! یہ کون کہتا ہے؟ یہ ہماری لونڈی ہے جو کہ محمد بن عجلان کی بیوی ہے، حاملہ ہوتی ہے اور چار سال میں حمل وضع کرتی ہے، بہت زیادہ سچی عورت ہے اور اس کا شوہر بھی بہت زیادہ سچا ہے۔ اس نے تین حمل بارہ سال کی مدت میں وضع کیے ہیں۔ اس کا ہر حمل چار سال کا ہوتا۔ مبارک بن مجاہد نے اس بات کو ذکر کیا ہے اور کہا: ہمارے ہاں مشہور تھا کہ محمد بن عجلان کی بیوی چار سال میں حمل وضع کرتی تھی اور اسے حاملۃ الفیل کہا جاتا تھا۔ اس نے ہی روایت کیا ہے کہ ایک دن حضرت مالک بن دینار بیٹھے تھے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا، اس نے کہا: اے ابو یحییٰ! چار سال سے حاملہ عورت کے لیے دعا مانگو وہ شدید تکلیف میں ہے، مالک سخت غصے ہوئے اور مصحف کو بند کیا پھر کہا: یہ قوم ہمیں انبیاء خیال کرتی ہے پھر پڑھا پھر دعا مانگی پھر کہا: اے اللہ! اگر اس عورت کے پیٹ میں ہوا ہے تو اسے ابھی خارج فرما اور اگر اس کے پیٹ میں بچی ہے تو اسے بچے میں تبدیل فرما، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے، تیرے پاس ''ام الکتاب'' ہے۔ حضرت مالک نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھائے، قاصد اس آدمی کے پاس آیا اور کہا: تیری بیوی کو کوئی مسئلہ ہے، وہ آدمی گیا۔ حضرت مالک نے ابھی

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 280

2۔ ایضاً، حدیث 282

اپنے ہاتھ نیچے نہیں کیے تھے کہ مسجد کے دروازے سے وہ آدمی سامنے ہوا اس کی گردن پر ایک بچہ تھا جس کے بال سخت گھنگریالے تھے، (تقریباً) چار سال کا بچہ، اس کے دانت بالکل برابر تھے اور اس کی ناف کٹی ہوئی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا (1) اس نے کہا: اے امیر المومنین! میں دو سال اپنی عورت سے غائب رہا میں واپس آیا تو وہ حاملہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے رجم کے بارے میں لوگوں کے ساتھ مشاورت کی، تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المومنین! اگرچہ آپ کو اس عورت پر اختیار حاصل ہے لیکن اس کے پیٹ پر کوئی اختیار نہیں۔ اس کو چھوڑ دیں یہاں تک کہ یہ وضع حمل کر لے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا، تو اس نے ایسا بچہ جنا جس کے سامنے والے دانت نکل چکے تھے، آدمی نے مشابہت کو پہچان لیا اور کہا: رب کعبہ کی قسم! یہ میرا بیٹا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: عورتیں معاذ جیسا انسان پیدا نہیں کر سکیں، اگر معاذ نہ ہوتا تو عمر ہلاک ہو گیا ہوتا۔ ضحاک نے کہا: میری ماں نے مجھے جنا اس حال میں کہ دو سال اس نے مجھے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ اس نے مجھے جنا تو میرے دانت نکل چکے تھے۔ امام سے ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ بھی دو سال تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہے، ایک قول کے مطابق تین سال رہے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن عجلان تین سال تک اپنی ماں کے پیٹ میں رہا، ان کی ماں فوت ہو گئی اور وہ بہت زیادہ الٹ پلٹ ہو رہے تھے، تو اس کا پیٹ چاک کیا گیا اور انہیں نکالا گیا تو ان کے دانت نکل چکے تھے۔ حماد بن سلمہ نے کہا ہے کہ ہرم بن حیان کو ہرم کہتے ہی اس لیے ہیں کہ یہ اپنی ماں کے پیٹ میں چار سال رہے۔ غزنوی نے ذکر کیا کہ ضحاک دو سال میں پیدا ہوا۔ اور اس کے دانت نکل چکے تھے تو اس کا نام ضحاک رکھ دیا گیا۔ عباد بن عوام نے کہا: ہماری ایک لونڈی نے چار سال میں بچہ جنا جس کے بال کندھوں تک پہنچ چکے تھے اس کے پاس سے پرندہ گزرا تو اس نے کہا: "کش"۔

مسئلہ نمبر 6۔ ابن خویز منداد نے کہا: حیض اور نفاس کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت اور حمل کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ مدت بطریق اجتہاد ماخوذ ہے، کیونکہ ان کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، لہٰذا ان میں سے کسی چیز پر اتنا ہی حکم لگانا درست ہوگا جتنا ہمارے سامنے ظاہر ہوا ہو یا جتنا عورتوں میں عادتاً پایا جاتا ہو یا نادر طور پر جتنا پایا گیا ہو۔ جب ہم نے کسی عورت کے حمل کو چار یا پانچ سال دیکھ لیا تو ہم نے اس کا حکم لگا دیا، اور جب حیض اور نفاس کے سلسلہ میں ہم نے کوئی مستقل صورت نہ دیکھی تو ہم نے دیکھا کہ عورتوں میں شاذ و نادر پائی جانے والی مدت کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ ابن عربی نے (2) کہا: بعض تساہل پسند مالکیوں سے منقول ہے کہ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت نو ماہ ہے۔ اور یہ قول سوائے ہلاکت میں پڑنے والے کے کسی نے کبھی بھی نہیں کیا، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ رحم میں تدبیر کرنے والے سات سیارے ہیں وہ ایک ایک ڈیوٹی کرتے ہیں۔ چوتھا مہینہ سورج کا ہوتا ہے، اسی وجہ سے بچہ حرکت کرتا ہے اور اضطراب میں ہوتا ہے۔ جب سات ماہ میں سات سیاروں کے درمیان چکر مکمل ہو جاتا ہے تو آٹھویں ماہ میں وہ کام زحل کے سپرد ہوتا ہے تو وہ اپنی ٹھنڈک کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے، کاش میں ان کے ساتھ مناظرہ کرنے یا جنگ کرنے پر

1۔ سنن دار قطنی، کتاب النکاح، جلد 2، صفحہ 323، حدیث 281
2۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 1109

قادر ہوتا، کتنا عجیب ہے چکر تمام ہونے کے بعد وہ زحل پر ہی آسکتا ہے کسی اور کے پاس نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی خبر دی ہے یا تم اللہ تعالیٰ پر بہتان تراشی کرتے ہو؟ اور جب یہ ممکن ہے کہ ان میں سے دو کے پاس تدبیر دوبارہ لوٹ سکتی ہے تو یہ کیوں جائز نہیں کہ وہ تدبیر تین یا چار کے پاس دوبارہ آجائے یا تمام کے پاس دو، تین مرتبہ لوٹ آئے؟ امور باطنہ پر یہ کیسا باطل گمانات کے ساتھ فیصلہ ہے؟

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ یعنی نقصان اور زیادتی میں سے بِمِقْدَارٍ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ماں کے پیٹ سے بچے کے نکلنے کی مقدار اور نکلنے تک اس کے پیٹ میں اس کے ٹھہرنے کی مقدار ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس سے مراد رزق اور زندگی کی مقدار ہے (1)۔ مقدار سے مراد قدر ہے۔ اور آیت کا عموم ان سب کو شامل ہے۔ واللہ سبحانہٗ اعلم

میں (قرطبی) نے کہا: یہ آیت اللہ تعالیٰ کی مدح بیان کرتی ہے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، یعنی وہ اس چیز کو بھی جانتا ہے جو مخلوق سے غائب ہے اور اس کو بھی جانتا ہے جس کا مخلوق نے مشاہدہ کر رکھا ہے۔ غیب بمعنی غائب مصدر ہے اور شہادۃ بمعنی شاھد مصدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم غیب میں منفرد ہونے اور مخلوق پر مخفی چیزوں کا باطن کے ذریعے احاطہ کرنے پر آگاہ فرمایا ہے، اس معاملے میں کسی کی شرکت جائز نہیں، جہاں تک اہل طب کا تعلق ہے جو نشانیوں اور علامات کے ذریعے استدلال کرتے ہیں تو اگر وہ اس کے بارے میں قطعی بات کرتے ہیں تو یہ کفر ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ یہ تجربہ ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ عادت و تجربہ ٹوٹنا کام بھی ہو سکتا ہے جبکہ علم میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ الکبیر یعنی وہ ذات کہ ہر چیز اس سے کم درجے میں ہے المتعال اس سے بلند ہے جو مشرکین کہتے ہیں۔ ہر چیز سے اپنی قدرت اور قہر کے ذریعے بلند و برتر ہے۔ ان دونوں صفات کا ذکر ہم (قرطبی) نے ''شرح الاسماء'' میں مکمل طور پر کر دیا ہے۔ والحمد للہ

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ⑩

''(اس کے علم میں) سب یکساں ہیں تم میں سے وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور جو بلند آواز سے بات کرتا ہے اور وہ بھی جو چھپا رہتا ہے رات کے وقت اور جو چلتا پھرتا رہتا ہے دن کے وقت''۔

قولہ تعالیٰ: سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ۔ اَسَرَّ الْقَوْلَ سے مراد وہ بات ہے (2) جو بندہ اپنی ذات کے ساتھ کرے اور جَهَرَ سے مراد وہ بات ہے جو بندہ کسی اور کے ساتھ کرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خیر و شر میں جو بندہ پوشیدہ طور پر کرے اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے جس طرح کہ وہ اسے جانتا ہے جو ظاہری طور پر ہو۔ مِّنْكُمْ کے بارے میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ سَوَآءٌ کی صفت ہو اور تقدیر کلام یوں ہو: سر من اسر و جهر من جهر سواء منكم اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سَوَآءٌ کے متعلق ہو کلام یوں ہو: يستوى منكم جس طرح کہ آپ کا قول: مررت بزيد اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تقدیر

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 97 2۔ ایضاً

عبارت یہ ہو: سِرٌّ من أَسَرَّ منکم و جهرٌ مَنْ جَهَرَ منکم تقدیر عبارت یہ بھی ہو سکتی ہے: ذو سواء منکم من أسرّ القول و من جهر به جس طرح کہا جاتا ہے: عدل زید و عمرو یعنی ذوا عدل۔ ایک قول یہ ہے کہ سَوَآءٌ بمعنی مستوٍ ہے اس صورت میں مضاف کے حذف کی تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں۔

وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ یعنی پوشیدہ وظاہر، راستوں میں ظاہر اور تاریکیوں میں چھپا ہوا اللہ کے علم میں برابر ہیں۔ اُخفش اور قطرب نے کہا: رات میں چھپا ہوا ظاہر ہے۔ اسی سے خَفَيتُ الشئی و أخفیتُه ہے یعنی أظهرتُه اور أخفیتُ الشئی یعنی استخرجتُه۔ اسی سے کفن چور کو مختفی کہا جاتا ہے۔ امرؤ القیس نے کہا:

خَفَاهُنَّ مِنْ أَنْفَاقِهِنَّ كَأَنَّمَا خَفَا هُنَّ وَدْقٌ من عَشِيٍّ مُجلِّبِ

السارب کا معنی التواری یعنی سرنگوں میں چھپنے والا ہے۔

السارب المتواری سے مراد داخل سربا ہے اسی سے عربوں کا قول انسرب الوحشیّ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اپنی کچھار میں داخل ہو جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مُسْتَخْفٍ بمعنی پوشیدہ اور سَارِبٌ بمعنی ظاہر ہے۔ مجاہد نے کہا: مُسْتَخْفٍ یعنی وہ گناہوں کے ساتھ چھپتا ہے اور سَارِبٌ بمعنی ظاہر ہے۔ ایک قول کے مطابق سَارِبٌ کا معنی ذاہب ہے۔ کسائی نے کہا: سَرَبَ یسرب سَرَباً و سُروباً کہا جاتا ہے جب کوئی چلا جائے۔ شاعر نے کہا:

وكلُّ أُناسٍ قَارَبوا قَيْدَ فَحْلِهِمْ ونَحْنُ خَلَعْناَ قَيْدَه فهو سارِبٌ(1)

سَارِبٌ سے مراد ذاہب ہے۔ ابورجاء نے کہا: السارب سے مراد زمین میں اپنے اعتبار پر چلنے پھرنے والا آدمی ہے۔ شاعر نے کہا:

أَنَّى سَرَبْتِ وكنتِ غيرَ سَرُوبِ(2)

قتبی نے کہا: سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ یعنی اپنی ضروریات کے سلسلہ میں تیزی سے گھومنے پھرنے والا۔ یہ عربوں کے قول انسرب الماء سے مشتق ہے۔ اصمعی نے کہا: خَلِّ سَرْبَه یعنی اس کا راستہ خالی کر دو۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

"انسان کے لیے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اس کے پیچھے بھی وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے، اور جب ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی ٹال نہیں سکتا اسے اور نہ ہی ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے"۔

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 237
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 98

قولہ تعالیٰ: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ یعنی اللہ تعالیٰ کے ایسے فرشتے ہیں جو رات، دن انسان کا تعاقب کرتے رہتے ہیں، جب رات کے فرشتے اوپر چلے جاتے ہیں تو دن کے فرشتے ان کے پیچھے آجاتے ہیں(1)۔ اللہ تعالیٰ نے مُعَقِّبٰتٌ فرمایا ہے۔ فرشتے مذکر ہیں کیونکہ معقبات، معقبہ کی جمع ہے اور کہا جاتا ہے: ملکٌ مُعَقِّبٌ اور ملائکۃٌ مُعَقِّبَۃٌ، پھر معقباتٌ جمع الجمع ہے۔ بعض لوگوں نے لَهٗ مَعَاقِبُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ پڑھا ہے۔ معاقیب، معقب کی جمع ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ملائکۃ کے لیے معقبۃٌ کا لفظ ملائکۃ کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں کی طرف سے تعاقب کی کثرت کی وجہ سے مُعقبۃ مؤنث ہے جیسے نسابۃ، علامۃ اور راویۃ وغیرہ۔ یہ جوہری وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اور تَعَقُّب شروع کرنے کے بعد لوٹنے کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ (النمل: 10) یعنی لم یرجع۔ اور حدیث میں ہے: مُعَقِّبَاتٌ لَا یَخِیبُ مَائلھُنَّ۔ أو۔ فاعلھنّ (2) پھر آپ نے تسبیح، تحمید اور تکبیر کا ذکر فرمایا ہے۔ ابوالہیثم نے کہا: ان کو معقباتٌ اس لیے کہا گیا کہ یہ بار بار لوٹتے رہتے ہیں جیسے ایسے آدمی کا فعل کہ جو ایک کام کرے پھر دوبارہ وہی کام کرے تو اس وقت کہا جائے گا: فقد عَقَّبت اور اونٹنیوں میں سے معقّبات وہ ہوتی ہیں جو حوض پر وارد ہونے والے اونٹوں کے پچھلے حصے کے پاس کھڑی ہوتی ہیں اور جب ایک اونٹنی اس جگہ سے نکلتی ہے تو دوسری اس کی جگہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ یعنی رات کے وقت چھپنے والے(3) اور دن کے وقت چلنے پھرنے والے کے آگے۔ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ حفظ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور مہربانی وحشیوں، درندوں اور نقصان دہ چیزوں سے ان کی حفاظت کے لیے فرشتوں کی ڈیوٹی لگائی گئی ہو، اور جب تقدیر (غالب) آجائے تو وہ فرشتے بندے اور اس نقصان دہ چیز کے درمیان سے ہٹ جاتے ہوں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ ابومجلز نے کہا: مراد قبیلے کا ایک آدمی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اس نے کہا: بچ کے رہیے مراد قبیلے کے کچھ لوگ آپ کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں بشرطیکہ تقدیر نہ آئی ہو، اور جب تقدیر آجائے تو وہ بندے اور اللہ کی تقدیر کے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں، بے شک موت بذات خود بہترین قلعہ ہے۔ اسی بنیاد پر یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے امر اور اس کے اذن سے من بمعنی با ہے اور حروف صفات ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے رہتے ہیں اور ایک قول یہ بھی ہے من بمعنی عن ہو یعنی یحفظونه عن أمر الله، یہ پہلے معنی کے قریب تر ہے۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے: جس طرح کسوته عن عُرْیٍ و من عُرْیٍ دونوں طرح مستعمل ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ ہے یعنی عَنْ جوعٍ ایک قول ہے: وہ عذاب کے فرشتوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو سزا دینا روا نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی نعمت و عافیت کو تبدیل نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ خود کفر پر اصرار کے ذریعے تبدیل نہ کردیں، جب وہ کفر پر ڈٹتے ہیں تو ان کی سزا کی مدت قریب آجاتی ہے، ان پر مصیبت نازل

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 98

2۔ تاریخ بغداد، جلد 6، صفحہ 112، العربیۃ بغداد

3۔ تفسیر زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 341

ہوتی ہے اور حفاظت کرنے والے فرشتے ان سے ہٹ جاتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے: وہ جنات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ حضرت کعب نے کہا(1): اگر اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے فرشتوں کے سپرد نہ کرتا جو تمہارے کھانے، پینے اور شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں تو جن اور عذاب کے فرشتے تمہیں اللہ کے امر سے ضرور چھین لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ فرمایا کے خاص فرمایا کیونکہ وہ دیکھ نہیں رہے ہوتے جس طرح اللہ نے فرمایا: قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء: 85) فرما دیجیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے یعنی یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کا تم مشاہدہ کرتے ہو۔ فراء نے کہا کہ کلام میں تقدیم و تاخیر ہے(2)، تقدیر عبارت یہ ہے: له معقبات من أمرالله من بين يديه و من خلفه يحفظونه، یہ مجاہد، ابن جریج اور نخعی سے مروی ہے۔ اور اگر یحفظونه من ملائكة العذاب والجن من أمرالله ہو تو پھر کوئی تقدیم و تاخیر نہیں۔ ابن جریج نے کہا: وہ فرشتے بندے کے عمل کو محفوظ کرتے ہیں۔ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ قتادہ نے کہا: وہ اس کے اقوال و افعال کو لکھتے ہیں۔ جب مُعَقِّبٰتٌ فرشتے ہوں تو لَهٗ کی ھا ضمیر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستخفی کے لیے ہو۔ ایک قول کے مطابق: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ (الرعد: 7) سے چلا ہے یعنی تم میں سے سب اس بات میں یکساں ہیں وہ بھی جو آہستہ بات کرتا ہے اور وہ بھی جو بلند آواز سے بات کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ نقصان نہیں دے سکتا بلکہ اللہ کے ایسے فرشتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تمام انبیاء کی طرف راجع ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وَّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۠ ارشاد فرمایا ہے، یعنی يحفظون الهادي من بين يديه و من خلفه اور چوتھا قول یہ ہے کہ آیت سے مراد وہ سلاطین و امراء ہیں جن کی قوم ان کے آگے اور پیچھے سے ان کی حفاظت کرتی ہے اور جب اللہ کا امر آ جاتا ہے تو اللہ سے وہ انہیں ذرہ بھر بھی نہیں بچا سکتے۔ یہ حضرت ابن عباس اور حضرت علی کا قول ہے۔ اور اسی طرح ضحاک نے کہا: اس سے مراد وہ مشرک بادشاہ ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے امر سے بچاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس تاویل کی صورت میں کلام میں نفی محذوف ہے یعنی لا يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ۔ یہ ماوردی نے ذکر کیا ہے۔ مہدوی نے کہا: مُعَقِّبٰتٌ کو محافظ بنانے کی صورت میں معنی ہوگا: يحفظونه من أمرالله على ظنه وزعمه، ایک قول یہ ہے: یکساں ہے جو آہستہ بات کرتا ہے اور بلند آواز سے بات کرتا ہے تو اس کے محافظ اور مددگار ہیں جو اس کا تعاقب کرتے ہیں اور اسے گناہ و نافرمانی پر ابھارتے ہیں، اور اس میں نصیحت کے مؤثر ہونے سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ قشیری نے کہا: یہ پروردگار عالم کو مہلت دینے سے نہیں روکتی یہاں تک کہ وہ عذاب کو ثابت کر دے۔ تو اس صورت میں اس نافرمان نے بذات خود گناہ پر اصرار کو لمبا کر کے اس حکم کو تبدیل کر دیا تو یہی چیز سزا کا سبب بن جائے گی تو گویا وہ ایسا آدمی ہے جس نے بذات خود سزا کو حلال کر لیا ہے، تو اللہ کا ارشاد: يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ سے مراد يحفظونه من انتقال أمرالله ہوگا۔ عبدالرحمن بن زید نے کہا: مُعَقِّبٰتٌ سے مراد وہ ہیں جو اللہ کے امر اور اس کی قضا سے اس کے بندوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ ماوردی نے کہا: جس آدمی نے یہ بات کی ہے تو اس کے مطابق يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ

1۔ تفسیر زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 239 2۔ ایضاً

اللہ کے ارشاد کی تاویل کی دو صورتیں ہوں گی۔

نمبر 1:۔ وہ اس کی تب تک موت سے حفاظت کریں گے جب تک موت نہیں آتی۔ یہ ضحاک کا قول ہے۔

نمبر 2:۔ وہ اس کی جنوں اور موذی درندوں سے حفاظت کریں گے جب تک تقدیر غالب نہیں آتی (1)، یہ ابوامامہ اور کعب الاحبار کا قول ہے اور جب تقدیر آ جائے گی تو وہ راستہ خالی چھوڑ دیں گے اور صحیح بات یہ ہے کہ **معقبات** سے مراد فرشتے ہیں۔ یہی حضرت حسن، مجاہد، قتادہ اور ابن جریج نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور نحاس نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ''رات اور دن کے فرشتے تمہارا تعاقب کرتے ہیں'' (2)۔ الحدیث اس کو ائمہ نے روایت کیا ہے۔ ائمہ نے عمرو عن ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ آپ نے اس کی تلاوت یوں کی ہے: **معقبات من بین یدیه و رقباء من خلفه (من أمر الله) یحفظونه** تو اس نے معنی کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ کنانہ عدوی نے کہا: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے بندے کے بارے میں بتایئے کہ اس کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ایک فرشتہ آپ کے دائیں طرف ہوتا ہے جو نیکیاں لکھتا ہے اور دوسرا بائیں جانب جو برائیاں لکھتا ہے اور جو دائیں جانب والا ہے وہ بائیں جانب والے پر امیر ہوتا ہے جب آپ نیک عمل کرتے ہیں تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب آپ برا عمل کرتے ہیں تو بائیں جانب والا، دائیں جانب والے کو کہتا ہے کیا میں لکھوں؟ وہ کہتا ہے نہیں شاید یہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے اور توبہ کر لے۔ جب وہ تین دفعہ کہتا ہے تو یہ کہتا ہے: ہاں لکھ، ہمیں اللہ تعالیٰ اس سے بچائے پس کتنا برا ساتھی ہے وہ جو اللہ تعالیٰ کی نگرانی کو کم خیال کرتا ہے اور اپنے حیاء کے حوالے سے تھوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ** ۝ (ق) وہ کوئی بات نہیں کرتا مگر اس کے پاس ایک سخت تاڑنے والا ہوتا ہے اور دو فرشتے آپ کے سامنے اور پیچھے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ** (اور ایک فرشتہ آپ کی پیشانی پر قابض ہوتا ہے جب آپ اللہ کے لیے جھکتے ہیں تو وہ آپ کو اٹھا دیتا ہے اور جب تو اللہ تعالیٰ کو مجبور کرتا ہے تو وہ تجھے ہلاک کر دیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے ہونٹوں پر ہوتے ہیں اور وہ صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی آل پر پیش کیا گیا درود محفوظ کرتے ہیں اور ایک فرشتہ تیرے منہ پر کھڑا ہوتا ہے وہ تیرے منہ میں سانپ کو داخل نہیں ہونے دیتا اور دو فرشتے تیری آنکھوں پر ہوتے ہیں تو یہ دس فرشتے ہیں جو ہر آدمی پر مسلط ہوتے ہیں رات کے فرشتے، دن کے فرشتوں سے بدلتے رہتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے، دن کے فرشتے نہیں ہوتے تو یہ کل بیس فرشتے ہر آدمی پر مسلط ہوئے اور ہر آدمی کے ساتھ ابلیس دن کے وقت ہوتا ہے جبکہ اس کا بیٹا رات کے وقت، اس کو ثعلبی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: **مُعَقِّبٰتٌ**، چار فرشتے ہیں (3) جو فجر کی نماز کے وقت جمع ہوتے ہیں اور طبری کا مختار یہ ہے کہ **معقبات** سے مراد اسراء کے سامنے اور پیچھے والی بھیڑ ہے اور **لَهٗ** کی ھاضمیر ان کے لیے ہے۔ علماء نے کہا:

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 99
2۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، فضل صلوٰۃ العصر، جلد 1، صفحہ 79
3۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 98

اللہ تعالیٰ نے اپنے احکامات کو دو طرح بنایا ہے ایک وہ جن کے وقوع پذیر ہونے کا اس نے فیصلہ فرما دیا ہے ان کو نہ کوئی روک سکتا ہے اور نہ ہی ان کو کوئی تبدیل کر سکتا ہے، جبکہ دوسرے احکامات وہ ہیں جن کے آنے کا اس نے فیصلہ فرما دیا البتہ وقوع پذیر ہونے کا فیصلہ نہیں فرمایا، بلکہ توبہ، دعا، صدقہ اور حفاظت کے ذریعے ان کے ٹل جانے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ وہ کسی قوم کو تب تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ ان کی طرف سے تبدیلی وقوع پذیر نہ ہو یا تو یہ تبدیلی ان کی طرف سے ہو، یا ان کے دیکھنے والوں کی طرف سے یا کسی ایسے آدمی کی طرف سے ہو جو ان میں سے ہو، جس طرح اللہ تعالیٰ نے غزوہ احد کے دن تیراندازوں کی بذات خود تبدیلی کے سبب انہیں شکست خوردہ لوگوں کے ساتھ بدل دیا، اس کے علاوہ بھی شریعت کی مثالیں موجود ہیں۔ آیت کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف گناہ کے سرزد ہونے کی صورت میں ہی عذاب نازل فرماتا ہے بلکہ بعض اوقات دوسرے لوگوں کے گناہوں کے سبب بھی مصائب نازل ہوتے ہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپ سے پوچھا گیا کہ کیا ہم نیک لوگوں کی موجودگی میں بھی ہلاک کر دیئے جائیں گے؟ تو آپ نے فرمایا: ''ہاں جب خبث (زنا) زیادہ ہو جائے گا'' (1)۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا یعنی ہلاک کرنے اور عذاب نازل کرنے کا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ایک قول یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ بیماریوں وغیرہ میں سے کسی مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو اس مصیبت کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو برائی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو ان کی بصارت کو اندھا کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ ایسا کام اختیار کرتے ہیں جس میں مصیبت ہوتی ہے اور اسی کو عملی جامہ پہنا دیتے ہیں اور خود اپنے قدموں پر چل کر ہلاکت کی طرف جاتے ہیں یہاں تک کہ آدمی خود اپنے ہاتھ سے بربادی تلاش کرتا ہے اور اپنے قدم پر چل کر اپنے خون کو بہانے کی طرف جاتا ہے وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ یعنی کوئی پناہ گاہ۔ یہ سدی کے قول کا معنی ہے۔ ایک قول یہ ہے: وہ کوئی مددگار نہیں پاتا جو اسے اس عذاب سے بچا سکے۔ شاعر نے کہا:

ما فی السماء سوی الرحمن من وال (2)

آسمان میں رحمٰن کے علاوہ کوئی مدد کرنے والا نہیں

وال اور والی ایسے ہیں ہے جیسے قادر اور قدیر۔

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ﴿۱۲﴾ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَ هُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ؕ﴿۱۳﴾

''وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی (کبھی) ڈرانے کے لیے اور (کبھی) وعید دلانے کے لیے اور اٹھاتا ہے (دوش

1۔ صحیح بخاری، کتاب المناقب، علامات النبوۃ فی الاسلام، جلد 1، صفحہ 508
2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 100

ہوا پر) بھاری بادل اور رعد اس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے پھر گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے، اس حال میں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں اور اس کی پکڑ بہت سخت ہے"۔

قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ یعنی بارش کے ذریعے۔ السَّحَابَ جمع ہے اور واحد سَحَابَة ہے، سُحُبٌ اور سَحَائِبُ بھی جمع آتی ہے۔ وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ رعد، برق اور صواعق کے بارے میں سورۃ البقرہ میں گفتگو گزر چکی ہے اس لیے اعادہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور آیت سے مقصود اپنی قدرت کے کمال کو بیان کرنا ہے۔ اور سزا میں تاخیر عاجزی کی وجہ سے نہیں، یعنی مسافر کو ڈرانے کے لیے آسمان میں تمہیں بجلی دکھاتا ہے، تو وہ بارش، دھول اور کڑکتی بجلی سے پہنچنے والے نقصان کی اذیت سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ (النساء: 102) اور مقیم کو اس بات کی امید دلانے کے لیے کہ اس کڑک کے بعد بارش اور شادابی ہوگی؛ یہ معنی حضرت قتادہ، مجاہد اور دیگر لوگوں نے بیان کیا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: بجلی کی کڑک سے ڈراتے ہوئے اور اس کی بارش جو قحط کو زائل کرنے والی ہوگی اس سے امید دلاتے ہوئے (1)۔ وَ يُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ مجاہد نے کہا: پانی کے ذریعے وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ جس نے کہا کہ کڑک بادل کی آواز ہے تو اس صورت میں ممکن ہے کہ کڑک پاکی بیان کرتا ہو، اس قول کی صحت پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے کہ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ یہی اگر رعد فرشتہ ہوتا تو پھر تو سب فرشتوں کے تحت داخل تھا۔ جس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رعد فرشتہ ہے تو اس کے نزدیک مِنْ خِيْفَتِهٖ کا معنی مِنْ خيفة الله ہوگا۔ یہ طبری وغیرہ کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: فرشتے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں مگر وہ ابن آدم کی طرح نہیں ڈرتے بلکہ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں پہچانتا کہ اس کے دائیں کون ہے اور بائیں کون ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نہ انہیں کھانا روکتا ہے اور نہ پینا۔ آپ نے ہی فرمایا: رعد فرشتہ ہے جو بادلوں کو ہانکتا ہے اور پانی کے بخارات اس کے انگوٹھے کے پورے میں ہوتے ہیں وہ بادلوں کا موکل ہے ان میں اسی طرح تصرف کرتا ہے جس طرح اسے حکم ہوتا ہے اور وہ اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جب رعد تسبیح کرتا ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ تسبیح کے ساتھ اپنی آواز بلند کرتا ہے، تو اس وقت بارش برستی ہے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ جب آپ رعد کی آواز سنتے تو کہتے: سبحان الذی سبحت له پاک ہے وہ ذات جس کی تو نے پاکی بیان کی ہے۔ امام مالک نے حضرت عامر بن عبداللہ عن ابیہ روایت کیا ہے کہ جب وہ رعد کی آواز سنتے تو کہتے: پاک ہے وہ ذات کہ رعد جس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں)۔ پھر کہتے کہ یہ اہل زمین کے لیے سخت وعید ہے۔ ایک قول یہ ہے: یہ ایک فرشتہ ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوتا ہے، اس کے دائیں جانب ایک ہزار فرشتہ ہے اور بائیں جانب بھی اتنے ہی فرشتے ہیں، جب دائیں جانب والوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تسبیح کرتا ہے تو سارے اللہ کے خوف سے تسبیح کرتے ہیں اور جب بائیں جانب متوجہ ہو کر تسبیح کرتا ہے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 100

تو وہ سارے اللہ کے خوف سے تسبیح کرتے ہیں۔ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ ماوردی نے حضرت ابن عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور مجاہد سے یہ بات ذکر کی ہے یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی (1) جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مجھے بتایئے آپ کا رب کس چیز سے بنا ہوا ہے کیا لؤلؤ سے یا یاقوت سے؟ تو بجلی کی کڑک آئی اور اس نے اسے جلا دیا۔ ایک قول یہ ہے، یہ عرب کے کسی کافر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت حسن نے کہا: عرب کے سرکشوں میں سے ایک آدمی تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت اس کی طرف بھیجی تاکہ وہ اسے اللہ، اس کے رسول اور اسلام کی طرف دعوت دیں تو اس نے انہیں کہا: مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کے بارے میں بتاؤ کہ کیا ہے اور کس چیز سے بنا ہوا ہے کیا چاندی سے یا لوہے سے یا نحاس سے؟ قوم نے اس کی بات کو بہت بڑا سمجھا، تو اس نے کہا: میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے رب کے بارے میں جواب دیتا ہوں جس کو وہ پہچانتا ہی نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی طرف وفد بھیجا تو وہ ایسی ہی کہتا، تو وہ جماعت اس کے ساتھ جھگڑا کر رہی تھی اور اسے دعوت دے ہی رہی تھی کہ ایک بادل اٹھا اور ان کے سروں پر آ گیا، وہ کڑکا، چمکا اور اس نے بجلی پھینکی، تو اس بجلی نے کافر کو جلا دیا اور وہ بیٹھے رہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لوٹ کے آئے تو بعض صحابہ کرام نے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے کہا: تمہارا صاحب (مخالف) جل گیا۔ وفد نے کہا: تمہیں کہاں سے پتہ چلا؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی کہ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ اس کو ثعلبی نے حضرت حسن سے ذکر کیا ہے اور قشیری نے حضرت انس سے روایت بالمعنی بیان کی ہے۔ وہ عنقریب آئے گی۔ ایک قول یہ ہے: یہ آیت لبید بن ربیع کے بھائی اربد بن ربیع اور عامر بن طفیل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عامر بن طفیل اور اربد بن ربیع دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملنے کے ارادے سے آئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی جماعت میں مسجد میں تشریف فرما تھے۔ دونوں مسجد میں داخل ہوئے، لوگوں نے عامر کے جمال کو دیکھنا چاہا وہ بھینگا تھا اور بڑا خوبصورت تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کسی آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے چھوڑ دو اگر اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے تو اسے ہدایت دے دے گا۔ وہ آگے بڑھا حتیٰ کہ آپ کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہا: اے محمد! اگر میں اسلام قبول کر لوں تو میرے لیے کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ''تیرے لیے وہی ہوگا جو مسلمانوں کے لیے ہے اور تیری ذمہ داری وہی ہوگی جو دوسرے مسلمانوں کی ہے۔'' اس نے کہا: کیا اپنے بعد آپ مجھے خلیفہ بنائیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''یہ کام میرے سپرد نہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہ جس کو چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا''۔ اس نے کہا: کیا آپ مجھے مکان میں رکھیں گے اور خود خیمے میں رہیں گے، آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ اس نے کہا: آپ مجھے کیا دیں گے؟ آپ نے فرمایا: ''میں تجھے گھوڑوں کی مدد دوں گا جن کے ذریعے تو اللہ کے رستے میں جہاد کرے گا۔'' اس نے کہا: کیا آج میرے پاس گھوڑے نہیں ہیں؟ میرے ساتھ اٹھو میں آپ کے ساتھ گفتگو کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ اٹھے اور عامر نے اُربد کی طرف اشارہ کیا تھا کہ جب تو مجھے ان کے ساتھ گفتگو

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 102-101

کرتے دیکھے گا تو ان کے پیچھے چکر لگانا اور تلوار کے ساتھ ان کو شہید کر دینا۔ اس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا۔ اربد تلوار لے کر ایک بالشت چلا پھر اللہ نے اسے روک لیا، اور وہ تلوار کو نہ سونت سکا اور تلوار پر ہی اس کا ہاتھ خشک ہو گیا۔ اللہ نے آندھی اور چیخ وپکار والے دن اس پر بجلی کی کڑک ڈالی جس نے اسے جلا دیا اور عامر سرپٹ بھاگتا ہوا واپس لوٹا اور کہا: اے محمد ﷺ! آپ نے اربد کے لیے بددعا کی یہاں تک کہ اس نے اسے مار دیا، اللہ کی قسم! میں تم پر باریک بالوں والے گھوڑے اور بے ریش جوانوں کی بھرمار کر دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اور قیلہ کے بیٹے (یعنی اوس وخزرج) کے نوجوان تجھے اس کام سے روکیں گے۔'' عامر سلولیہ عورت کے گھر پہنچا اور صبح کے وقت کہتا جا رہا تھا: اللہ کی قسم! اگر محمد اور اس کا دوست یعنی ملک الموت مجھے صحراء میں مل گئے تو میں دونوں سے اپنا تیر گزار دوں گا، تو اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کے ساتھ اسے طمانچہ مارا اور اسے مٹی میں گرا دیا اور اس کے گھٹنے پر ایک بہت بڑا پھوڑا نکل آیا۔ وہ سلولیہ کے گھر واپس لوٹا اور کہتا جا رہا تھا: اونٹ کے پھوڑے کی طرح پھوڑا اور سلولیہ کے گھر میں موت، پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کی پیٹھ پر ہی مر گیا۔ لبید بن ربیع نے بھائی کا مرثیہ کہا ہے:

يا عينُ هلاّ بَكَيتِ أَرْبَدَ إِذْ قُمْنا وقَامَ الخُصُومُ فِي كَبَدِ

أَخْشَى عَلَى أَرْبَدَ الحُتُوفَ وَلَا أَرْهَبُ نَوْءَ السِّمَاكِ والأَسَدِ

فَجَّعَنِي الرَّعْدُ والصَّوَاعِقُ بالفا رِسِ يَوْمَ الكَرِيهَةِ النَّجِدِ(1)

اور اس کے متعلق اس نے یہ بھی کہا ہے:

إِنَّ الرَّزِيَّةَ لَا رَزِيَّةَ مِثْلُهَا فِقْدَانُ كُلِّ أَخٍ كَضَوْءِ الكَوْكَبِ

يَا أَرْبَدَ الخَيْرِ الكَرِيمَ جُدُودُهُ أَفْرَدْتَنِي أَمْشِي بِقَرْنٍ أَعْضَبِ

مسئلہ ۔ حضرت ابان نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کو بجلی نہیں پکڑتی (2)۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ جب کڑک کی آواز سنتے تو کہتے: سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکۃ من خیفتہ وھو علی کل شیء قدیر (جس نے یہ کلمات کہے) اسے اگر بجلی آ لے تو اس کی دیت مجھ پر ہے۔ خطیب بغدادی نے سلیمان بن علی کی حدیث حضرت عبد اللہ بن عباس عن أبیہ عن جدہ ذکر کی ہے آپ نے کہا: ہم ایک سفر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے کہ ہمیں کڑک اور بادلوں کی ہوا نے آ لیا، تو حضرت کعب نے ہمیں کہا: جس آدمی نے کڑک کی آواز سن کر سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکۃ من خیفتہ کے کلمات تین مرتبہ کہے تو اس کڑک میں موجود (نقصان) سے اسے معافی مل گئی، تو ہم نے ایسا ہی کیا تو ہم بچ گئے، پھر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ملا تو بادلوں کی ہوا آپ کے ناک کو لگی اور اثر انداز ہو گئی، میں نے کہا: اے امیر المومنین یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بادلوں کی ہوا میرے ناک کو لگی اور اثر انداز ہو گئی، تو میں نے کہا: کڑک کی آواز سن کر حضرت کعب نے ہمیں کہا تھا: جس نے

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 101 2۔ ایضاً

کڑک کی آواز سن کر سبحان من یسبح الرعد بحمدہ والملائکۃ من خیفتہ تین بار کہا تو اسے کڑک میں موجود (نقصان) سے نجات مل گئی، تو ہم نے یہ کلمات کہے تو ہمیں نجات مل گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم نے ہمیں کیوں نہ کہا تا کہ ہم بھی کہہ لیتے؟ اس کی تفصیل سورۂ ''بقرہ'' میں گزر چکی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ یعنی یہودی کا جھگڑا جب اس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں پوچھا کہ وہ کس چیز سے بنا ہوا ہے؟ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا: اس سے مراد اربد کا جھگڑا ہے (1) جب اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ حال ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عطف منقطع ہو۔ حضرت انس نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے ایک بڑے آدمی کے پاس وفد بھیجا تا کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دے، تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: مجھے اپنے معبود کے بارے میں بتاؤ! کیا وہ چاندی کا ہے، سونے کا ہے یا نحاس کا؟ تو اس وفد نے اس کو بڑی جسارت سمجھا۔ آپ کے پاس وفد واپس آیا اور اس نے آپ کو اس بات سے آگاہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کے پاس واپس جاؤ اور اسے دعوت دو''۔ وفد واپس پہنچا تو بجلی کی کڑک اسے اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی اور وہ وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لوٹا تو وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ کا ارشاد نازل ہوا۔ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ابن اعرابی نے کہا: الْمِحَالِ کا معنی مکر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکر کا معنی حق کی تدبیر ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا: اللہ کی طرف سے مکر ناپسندیدہ چیز کو ایسے طریقے سے اس کے مستحق کے سپرد کرنا ہے کہ جس سے احساس بھی نہ ہو۔ ابن یزیدی نے ابوزید سے روایت کیا کہ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ کا معنی ہے کہ وہ سخت بدلہ لینے والا ہے۔ ازہری نے کہا: الْمِحَالِ یعنی قوت اور شدت اور المحل سے مراد شدت ہے اس کی میم اصلی ہے، ماحلت فلاناً محالا یعنی میں نے اسے پکڑا یہاں تک کہ واضح ہو گیا کہ کون سخت ہے۔ ابوعبید نے کہا: الْمِحَالِ یعنی سزا اور ناپسندیدہ بات۔ ابن عرفہ نے کہا: الْمِحَالِ سے مراد جلال اور جھگڑا ہے۔ مَاحَلَ عن أمرہ کہا جاتا ہے جس کا معنی ہی جَادَلَ اس نے جھگڑا کیا۔ قتیبی نے کہا: اس سے مراد سخت چال ہے، اس کی اصل حیلہ سے ہے، اس کی میم مکان کی میم کی طرح ہے جس کی اصل کون ہے۔ ازہری نے کہا: ابن قتیبہ نے اس کی میم کو زائدہ کہہ کر غلطی کی ہے بلکہ اس کی میم اصلی ہے، جب تو کسی لفظ کو فعال کے وزن پر دیکھے جس کا پہلا حرف مکسور ہو تو وہ اصلی ہوتا ہے، جیسے مِهاد، مِلاك اور مِراس وغیرہ۔ اور مِفعل جب ثلاثی ہو تو یہ واؤ کے اظہار کے ساتھ آتا ہے جیسے مِزود، مِحوَل اور مِحوَر وغیرہ۔ ازہری نے کہا: اعرج نے اسے وَهُوَ شَدِيْدُ الْمَحَالِ میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرآت کے مطابق اس کی تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ حول سے مشتق ہے۔ یہ سارا ابوعبید ہروی نے ذکر کیا ہے سوائے اس کے جو پہلے ابن اعرابی کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ صحابہ و تابعین کی اس کے معنی کے متعلق تاویلات آٹھ ہیں۔

1:۔ شَدِيْدُ الْمِحَالِ کا معنی شدید العداوۃ یعنی دشمنی کی شدت ہے (2)، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

2:۔ اس کا معنی شدید الحول یعنی قوت و قدرت کی شدت والا ہے، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 102 2۔ ایضاً

3:۔ معنی شدید الاخذ یعنی پکڑ کی شدت والا ہے، یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

4:۔ شدید الحقد دلی دشمنی کی سختی والا، یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

5:۔ شدید القوۃ قوت کی شدت والا، یہ مجاہد کا قول ہے۔

6:۔ شدید الغضب غضب کی سختی والا۔ یہ وہب بن منبہ کا قول ہے۔

7:۔ شدید الھلاک بالمحل یعنی قحط کے ذریعے ہلاکت کی شدت والا، یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔

8:۔ شدید الحیلۃ یعنی حیلہ کی شدت والا، یہ حضرت قتادہ کا قول ہے۔

ابوعبیدہ معمر نے کہا: المحال اور المماحلۃ سے مراد مماکرۃ اور مغالبہ ہے۔

اعشیٰ نے شعر کہا ہے۔

فرع نبع یھتز فی غصن المجد کثیر الندی شدید المحال(1)

ایک اور شاعر نے کہا:

ولبس بین اقوام فکل أعدله الشغازب والمحالا

عبدالمطلب نے کہا:

لاھم إن المرئ یمنع رحلہ فامنع حلالک

لا یغلبن صلیبھم و محالھم عدوا محالک

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّیْهِ اِلَى الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

''اسی کو پکارنا سچ ہے اور وہ لوگ جو پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا وہ نہیں جواب دے سکتے انہیں کچھ بھی مگر اس شخص کی طرح جو پھیلائے ہوا اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف تاکہ اس کے منہ تک پانی پہنچ جائے اور (یوں تو) پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہیں کافروں کی دعا بجز اس کے کہ وہ بھٹکتی پھرتی ہے''۔

قولہ تعالیٰ: لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ یعنی اللہ کو پکارنا سچ ہے۔ حضرت ابن عباس (2)، حضرت قتادہ اور دیگر لوگوں نے کہا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ حضرت حسن نے کہا: بے شک اللہ ہی حق ہے، پس اس کی دعوت، دعوت حق ہے۔ ایک قول یہ ہے: دعا میں اخلاص حق کی پکار ہے، یہ بعض متاخرین کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق: حق کی دعوت، خوف کے وقت اس سے دعا ہے، خوف میں صرف اسی سے دعا کی جاتی ہے، جس طرح کہ اللہ کا ارشاد ہے: ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّاۤ اِیَّاهُ (الاسراء: 67) جس نے اس کے علاوہ کو پکارا وہ گمراہ ہوگیا۔ ماوردی نے کہا: یہ سیاق آیت کے مشابہ ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا: وَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اس سے مراد بت (اصنام واوثان) ہیں۔ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ لَهُمْ بِشَیْءٍ یعنی ان کی دعا کو وہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 520 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 103

قبول نہیں کرتے اور نہ ان کی ندا کو سنتے ہیں۔ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ان کی دعاؤں کے جواب سے ان کی مایوسی کی پانی کے ساتھ ضرب المثل بیان کی ہے کیونکہ عرب لاحاصل کام کی سعی کرنے والے کی ضرب المثل ہاتھ کے ساتھ پانی پکڑنے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

شاعر نے کہا:

فاصبحتُ مما کان بَيْنی وبينها من الودّ مثلَ القابِضِ الماء باليدِ (1)

میری اور اس (عورت) کے درمیان جو محبت تھی اس میں میں ہاتھ کے ساتھ پانی پکڑنے والے کی طرح ہو گیا۔

اس ضرب المثل کے معنی کی تین صورتیں ہیں (2):

1:۔ وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور معبود کو پکارتا ہے تو وہ اس پیاسے کی طرح ہے جو دور سے پانی کو اپنے منہ کی طرف بلاتا ہے اور زبان کے ذریعے اس پر قادر نہیں ہوتا، اپنے ہاتھ کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتا ہے تو وہ کبھی بھی اس کے پاس نہیں آئے گا کیونکہ پانی جواب نہیں دیتا اور نہ ہی پانی اس تک پہنچ پاتا ہے، یہ مجاہد کا قول ہے۔

2:۔ وہ اس پیاسے کی طرح ہے جو اپنے خیال میں پانی کو دیکھتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیتا ہے تا کہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے لیکن وہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کا خیال جھوٹا اور اس کے وہم میں فساد ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

3:۔ وہ ایسے آدمی کی طرح ہے جو پانی کی طرف اپنی ہتھیلی کو پھیلاتا ہے تا کہ اس کو پکڑ لے مگر اس کی ہتھیلی میں پانی میں سے کچھ بھی نہیں ٹھہرتا۔ فراء کا خیال ہے کہ ''الماء'' سے یہاں مراد کنواں ہے، کیونکہ یہ پانی کا معدن ہوتا ہے اور ضرب المثل یہ ہے کہ یہ آدمی اس آدمی کی طرح ہے جو بغیر رسی و ڈول کے اپنے ہاتھ کو کنویں کی طرف پھیلاتا ہے۔ بطور استشہاد یہ شعر ہے:

فانّ الماءَ ماءُ أبی وجدّی وبئری ذُو حَفَرْتُ و ذُو طَوَيْتُ

اس شعر میں ماء سے مراد کنواں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آدمی اس پیاسے کی طرح ہے جو کنویں کے کنارے پر ہوتا ہے، وہ کنویں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی پانی اس تک بلند ہوتا ہے۔ اور اِلَّا كَبَاسِطِ کا معنی ہے اِلَّا کاستجابة باسط کفیه ہے۔ مصدر باسط کی طرف مضاف ہے پھر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے اور مصدر مضاف کا فاعل ہی معنی میں مراد ہے اور وہ ہے ''الماء'' معنی یہ ہو گا: الا کإجابة باسط کفيه إلى الماء اور لِيَبْلُغَ فَاهُ میں لام باسط کے متعلق ہو گی اور اللہ کا ارشاد: وَ مَا هُوَ بِبَالِغِهٖ پانی سے کنایہ ہے، یعنی و ما الماء ببالغ فاہ اور پانی اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ هُوَ منہ سے کنایہ ہو یعنی ما الفم ببالغ الی الماء منہ پانی تک پہنچنے والا نہیں۔ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ یعنی کافروں کا بتوں کی پوجا کرنا سوائے گمراہی کے کچھ نہیں، کیونکہ یہ شرک ہے۔ ایک قول کے مطابق: اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ کا معنی یہ ہے کہ وہ دعا ان سے دور ہو جاتی ہے پس وہ اس سے کوئی حصہ نہیں پاتے جس طرح اللہ نے ارشاد فرمایا: اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالُوْا ضَلُّوْا

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 243 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 103

غَنًا (المومن) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس سے مراد یہ ہے کہ کافروں کی آواز اللہ تعالیٰ سے چھپ جاتی ہے پس وہ ان کی دعائیں سنتا ہی نہیں (1)۔

وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ۩

''اور اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ کررہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی''۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا حضرت حسن اور قتادہ وغیرہ نے کہا: مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے اور کافر تلوار سے مجبور ہوکر۔ حضرت قتادہ سے ہی مروی ہے کہ کافر کو جب ایمان کوئی فائدہ نہیں دیتا تو وہ مجبوراً سجدہ کرتا ہے۔ زجاج نے کہا: کافر کا سجدہ مجبوراً ہوتا ہے اس میں نہ خضوع ہوتا ہے اور نہ ہی عمل کا اثر۔ ابن زید نے کہا: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جو اسلام میں رغبت و شوق سے داخل ہوا (2) اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جو تلوار سے ڈر کر اسلام میں داخل ہوا۔ ایک قول یہ ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے (3) جس کے اسلام کی مدت لمبی ہے اور اس نے اس لمبی عمر کو سجدوں میں مصروف رکھا اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی ذات کو حقیر اور ناپسندیدہ سمجھتا ہے، تو اس صورت میں آیت مومنوں کے حوالے سے ہی ہے اس اعتبار سے وَ الْاَرْضِ سے مراد بعض من فی الارض ہے۔ قشیری نے کہا: آیت میں دو مسلک ہیں۔ ایک یہ کہ آیت عام ہے اور اس کی مراد مخصوص ہے، مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے (4) اور بعض کفار منافقین کی طرح مجبوراً اور خوف سے سجدہ کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آیت مومنین کے بارے میں ہے۔ ان میں سے بعض خوشی سے سجدہ کرتے ہیں ان پر سجدہ بھاری نہیں ہوتا اور بعض پر بھاری ہوتا ہے کیونکہ امور تکلیفیہ کا التزام مشقت ہے مگر وہ مشقت کو اخلاص اور ایمان کے ساتھ برداشت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ حق کو پالیتے ہیں اور اس پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ اور دوسرا مسلک یہ ہے کہ مومن خوشی سے سجدہ کرتا ہے جبکہ کافر کو سجدہ کا حکم ہے اور اس پر اس کا مواخذہ بھی ہوگا۔ دوسرا مسلک اور یہی حق ہے کہ مومن اپنے بدن کے ساتھ خوشی سے سجدہ کرتا ہے اور مومن و کافر ہر مخلوق اس اعتبار سے سجدہ کرتی ہے کہ وہ مخلوق ہے، جس طرح اللہ کا ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (الاسراء: 44) کوئی شے نہیں مگر وہ اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ تو یہ تسبیح دلالۃً ہوتی ہے عبادۃً نہیں۔ وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ یعنی مخلوق کے سائے صبح و شام اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، کیونکہ یہ (سائے) ان دو وقتوں میں جدا ہوتے ہیں، اور ایک طرف سے دوسری طرف جھکتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کا تصرف ہے جس طرح وہ چاہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اَوَ لَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ (النحل) کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں

1۔ تفسیر زاد المسیر، جلد 2، صفحہ 243 2۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 104

3۔ ایضاً 4۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1110

اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر لوگوں کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا: مومن کا سایہ خوشی سے سجدہ کرتا ہے کیونکہ وہ خوش ہوتا ہے جبکہ کافر کا سایہ مجبوراً سجدہ کرتا ہے کیونکہ وہ مجبور ہے۔ ابن انباری نے کہا: سایوں کی بھی عقلیں بنادی جاتی ہے جن کے ذریعے وہ سجدہ کرتے ہیں اور ان پر خشوع طاری ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کی سمجھ بنادی ہے یہاں تک کہ وہ مخاطب ہوتے ہیں اور انہیں مخاطب کیا جاتا ہے۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے، کیونکہ پہاڑ کی تو آنکھ ہے ممکن ہے زندگی کی تقدیر کی شرط کے ساتھ اس کی عقل بھی ہو جبکہ سائے تو آثار اور أعراض ہیں، ان کے لیے زندگی متصور نہیں۔ اور سجود جھکنے کے معنی میں ہے، پس سایوں کے سجود سے مراد ان کا ایک طرف سے دوسری طرف جھکنا ہے، سجدت النخلة کہا جاتا ہے یعنی کھجور کا درخت جھک گیا۔ الْاٰصَالِ، أُصُل کی جمع اور أُصُل، أَصِیل کی جمع ہے، اس سے مراد عصر سے لے کر غروب آفتاب کے درمیان کا وقت ہوتا ہے۔ پھر أَصائل جمع الجمع ہے۔ أبوذویب ہذلی نے کہا:

لَعَمْرِي لَأَنْتَ البيتُ أُكرِمُ أَهلَهُ ... وأقعدُ في أفيائِهِ بالأَصائِلِ(1)

اور ظِلٰلُهُمْ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مَنْ پر اس کا عطف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو اور خبر محذوف ہو، تقدیر عبارت یوں ہو: وظلالهم سُجَّدٌ بالغدو والآصال۔ الغدو مصدر بھی ہوسکتا ہے اور غداة کی جمع بھی ہوسکتا ہے، اور الْاٰصَالِ جمع کے مقابلے میں اس کا آنا اس کے جمع ہونے کو تقویت دیتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۭ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ⑯

”آپ (ان سے) پوچھیے: کون ہے پروردگار آسمانوں اور زمین کا؟ (خود ہی) فرمایئے: اللہ (انہیں) کہیے: کیا تم نے بنالیے ہیں اللہ کے سوا ایسے حمایتی جو اختیار نہیں رکھتے اپنے لیے کسی نفع کا اور نہ کسی نقصان کا (ان سے) پوچھیے: کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور بینا یا کیا یکساں ہوتے ہیں اندھیرے اور نور کیا انہوں نے بنائے ہیں اللہ کے لیے ایسے شریک جنہوں نے کچھ پیدا کیا ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا پس یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہوگئی ہو، فرمایئے: اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کو اور وہ ایک ہے سب پر غالب ہے“۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ تعالیٰ (2) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ آپ مشرکین کو فرمائیں:

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 104
2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 105

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ پھر اللہ نے فرمایا کہ اگر وہ اس کا جواب نہ دیں یا وہ اس سے ناواقف ہوں تو آپ خود ہی فرمایئے کہ وہ اللہ ہے۔ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ یہ آیت کریمہ ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کے اعتراف پر دلالت کرتی ہے ورنہ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ کے ذریعے استدلال نہ کیا جاتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد بطور دلیل پیش بھی کیا جاسکتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (لقمان: 25) اور اگر آپ ان سے پوچھیں گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ اب آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جب تم نے اعتراف کرلیا تو پھر اس کے علاوہ کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ اور وہ غیر کوئی نفع اور نقصان بھی نہیں دے سکتا۔ یہ الزام صحیح ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے ایک ضرب المثل بیان فرمائی ہے فرمایا: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ پس اسی طرح وہ مومن جو حق کو دیکھتا ہے وہ اور مشرک جو حق کو نہیں دیکھتا برابر نہیں ہو سکتے۔ ایک قول یہ ہے: اعمیٰ ان لوگوں کی مثال ہے جو اللہ کے علاوہ کی پوجا کرتے ہیں اور بصیر ان کی مثال ہے جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ یعنی شرک اور ایمان۔ ابن محیصن، ابوبکر، اعمش، حمزہ اور کسائی نے پہلے فعل کی وجہ سے "یستوی" یا کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ الظُّلُمٰتُ کی تانیث حقیقی نہیں، جبکہ باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے ابوعبید کے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔ ابوعبید نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ فعل اور مؤنث کے درمیان کوئی فاصلہ بھی نہیں۔ اور الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ ایمان اور کفر کی طرح ہے اور اس کی کیفیت سے واقف ہیں۔ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ یہ آیت استدلال کی تکمیل ہے، یعنی غیر اللہ نے اللہ کی طرح کوئی چیز تخلیق کی ہے تو یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہوگئی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے معبودوں نے کس چیز کو تخلیق کیا ہے۔ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! فرمایئے: اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہر چیز اس کی عبادت کرے (1)۔ یہ آیت ان مشرکین اور قدریہ کا رد ہے جن کا گمان یہ ہے کہ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی طرح تخلیق کی ہے۔ وَّ هُوَ الْوَاحِدُ یعنی ہر چیز سے پہلے الْقَهَّارُ یعنی ہر چیز پر غالب، ابونصر قشیری نے کہا: یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ آیت کریمہ ایسے لوگوں کے لیے نازل ہوئی ہو جو صانع کا اعتراف نہیں کرتے، یعنی آپ ان سے آسمانوں اور زمین کے خالق کے بارے میں پوچھیں، کیونکہ یہ ان کے خلاف اس سلسلہ میں حجت قائم کرنے کے لیے اور تقریب الی الافہام کے لیے آسان تھا۔ کہ جمادات اور ہر مخلوق کا آسمانوں اور زمین سے عاجز آنا تو (سب کے نزدیک) معلوم ہے۔ جب یہ بات پختہ ہو جائے گی اور ظاہر ہو جائے گا کہ صانع تو اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر اس کا شریک ٹھہرانا کیسے ممکن رہے گا؟ اور دوران کلام یہ بات تو واضح ہو چکی ہے کہ اگر اس جہان کے دو صانع ہوں تو تخلیق مشتبہ ہو جائے گی اور ایک کا فعل دوسرے کے فعل سے جدا نہیں ہو سکے گا، تو کیسے معلوم ہوگا کہ فعل دو کی طرف سے ہے؟

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 105

الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي
الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؔ وَ
الَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۬ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَاۤ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾

''اس نے اتارا آسمان سے پانی پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق، تو اٹھالیا سیلاب کی روانے ابھرا ہوا جھاگ۔ اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں زیور بنانے کے لیے یا دیگر سامان بنانے کے لیے اس میں بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے یوں اللہ تعالیٰ مثال بیان فرماتا ہے حق اور باطل کی۔ پس (بیکار) جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے اور جو چیز نفع بخش ہے لوگوں کے لیے تو وہ باقی رہے گی زمین میں، یونہی اللہ تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا بھلائی (ہی بھلائی) ہے اور جنہوں نے نہیں مانا اس کا حکم تو اگر ان کے ملک میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا ہی اور اس کے ساتھ تو وہ (عذاب سے بچنے کے لیے) اسے بطور فدیہ دے دیں۔ یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن کے لیے سخت باز پرس ہوگی اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری قرار گاہ ہے۔ تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو اندھا ہے، نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لیے ضرب المثل بیان فرمائی ہے کفر کو اس جھاگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو پانی پر اٹھتی ہے، یہ ختم ہو جاتی ہے اور وادیوں کی ایک جانب میں جمع ہوتی ہے اور ہوائیں اسے دھکیل کر لے جاتی ہیں پس اسی طرح کفر بھی چلا جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا، بِقَدَرِهَا سے مراد بقدر ملئها ہے یعنی اپنے بھرنے کے اندازے کے مطابق۔ ابن جریج نے کہا: اس سے مراد اپنے چھوٹے اور بڑے ہونے کے حساب سے۔ اشہب عقیلی اور حضرت حسن بصری نے بِقَدْرِهَا دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے: اس کا معنی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر فرمایا۔ الأودیہ وادی کی جمع ہے اور اس کو وادی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ نکلتی اور بہتی ہے۔ اس بنیاد پر وادی بہنے والے پانی کا نام ہے۔ ابوعلی نے کہا: أودیة توسع ہے یعنی اس کا پانی بہنے لگا تو اسے حذف کر دیا گیا، یعنی سال ماؤها اور بقدرها کا معنی بقدر میاهها ہے، کیونکہ وادی بذات خود اپنے اندازے سے نہیں بہتی۔ فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا یعنی پانی کے اوپر اٹھنے اور بلند ہونے والی، مجاہد کا کہا گیا کلام یہاں ختم ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ یہ دوسری ضرب المثل ہے۔ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ یعنی سونے اور چاندی کے زیور۔ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ مجاہد

نے کہا: متاع سے مراد لوہا، نحاس اور کچ ہے اور زَبَدٌ مِّثْلُهٗ سے مراد ہے کہ یہ چیزیں جھاگ پھینکتی ہیں جس طرح کہ پانی کا بہاؤ پھینکتا ہے اور صرف پانی کا بہاؤ جھاگ پھینکتا ہے کیونکہ پانی میں زمین کی مٹی شامل ہو جاتی ہے تو وہ اس کو جھاگ بنا دیتی ہے۔ اسی طرح جواہرات، سونے اور چاندی وغیرہ میں سے وہ چیزیں جو زمین کے معادن میں سے ہیں ان کو جب آگ پر گرم کیا جاتا ہے تو مٹی ان کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے، تو انہیں آگ پر گرم کیا جاتا ہے تا کہ وہ پگھل جائیں تو زمین کی مٹی زائل ہو جاتی ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۬ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً مجاہد نے جُفَآءً کا معنی جمود آ کیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ ابو عمرو بن علاء نے کہا ہے: جب ہانڈی میں ابال آئے اور جھاگ کو باہر پھینک دے تو أجفأت القدر کہا جاتا ہے۔ اور جُفاء سے مراد وہ ہے وادی نے جسے باہر پھینک دیا ہو۔ ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے رُوبۃ کو جُفالاً پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: جب ہانڈی جھاگ کو باہر پھینک دے تو أجفلَتِ القدر کہا جاتا ہے، اور جب ہوا بادلوں کو ختم کر دے تو أجفلت الریح السحاب کہا جاتا ہے۔ وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ مجاہد نے کہا: اس سے مراد خالص اور صاف شفاف پانی ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد پانی اور سونے، چاندی، لوہے، نحاس اور کچ میں سے جو خالص ہو چکا ہو وہ ہے۔ ان دونوں ضرب الامثال کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ثبات کے سلسلہ میں حق کے لیے اور باطل کے اضمحلال کے سلسلہ میں باطل کے لیے بیان کیا ہے، باطل اگرچہ بعض حالات میں بہت بلند ہوتا ہے تاہم جھاگ اور خبث کی طرح ختم ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد یہ ضرب المثل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور قرآن میں سے جو دلوں میں داخل ہوتا ہے اس کی مثال بیان فرمائی ہے، قرآن کو بارش کے ساتھ تشبیہ دی وجہ شبہ اس کی بھلائی کا عام ہونا اور اس کے نفع کا باقی ہونا ہے اور دلوں کو وادیوں کے ساتھ تشبیہ دی کہ ان میں قرآن داخل ہوتا ہے جس طرح کہ وادیوں میں ان کی وسعت اور تنگی کے حساب سے داخل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ''یعنی قرآنا۔ فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا آپ نے فرمایا: أودیۃ بندوں کے دل ہیں (1)۔ صاحب ''سوق العروس'' نے کہا: اگر یہ معنی صحیح ہے تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں قرآن کی مثال پانی کے ساتھ بیان فرمائی اور دلوں کی وادیوں کے ساتھ اور محکم کی صافی جبکہ متشابہ کی ''زبد'' کے ساتھ مثال بیان فرمائی ہے۔

ایک قول کے مطابق جس طرح کہ وادی کا پانی صاف ستھرا چلتا ہے تو وادی میں جو کچھ ہوتا ہے اس کو اٹھا لے جاتا ہے اور جہاں تک سونے اور چاندی کے زیورات کی بات ہے تو یہ ان اچھے احوال اور پاکیزہ اخلاق کی طرح ہیں جن کی وجہ سے مردوں کی خوبصورتی اور اعمال کی نیکی کی بنیاد ہے، جس طرح سونے اور چاندی سے عورتوں کی زینت ہے اور ان کی وجہ سے اشیاء کی قیمت ہے۔ حمید، ابن محیصن، اعمش، حمزہ، کسائی اور حفص نے يُوْقِدُوْنَ یا کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عبیدہ نے بھی يَنْفَعُ النَّاسَ کی وجہ سے اسی کو اختیار کیا تو اس لیے خبر دینا مقصود ہے اور یہاں مخاطبت کی کوئی صورت نہیں جبکہ باقی قراء نے کلام کے آغاز میں اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ کی وجہ سے تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فِي النَّارِ محذوف کے متعلق ہوگا یہ

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 106

حال کی جگہ پر ہے جبکہ ذوالحال عَلَيْهِ کی ھا ضمیر ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: ومما توقدون علیہ ثابتاً فی النار أو کائناً اور فِي النَّارِ میں ایک ضمیر مرفوع ہے جو اس ھا کی طرف لوٹتی ہے جو ذوالحال کا اسم ہے۔ اور فِي النَّارِ کو يُوْقِدُوْنَ کے متعلق کرنا درست نہیں کیونکہ أوقدتُ علیہ فی النار درست نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ موقد علیہ نار میں ہوگا تو اس صورت میں تو فِي النَّارِ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ مفعول لہ ہے۔ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ مبتدا اور خبر ہیں، یعنی زبدٌ مثل السیلِ ایک قول یہ ہے کہ زَبَدٌ کی خبر فِي النَّارِ ہے۔ کسائی کے نزدیک زَبَدٌ مبتدا ہے اور مِّثْلُهٗ اس کی صفت ہے اور خبر اس سے ماقبل جملے میں ہے اور وہ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ کا جملہ ہے۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ یعنی جس طرح اس نے تمہارے لیے یہ مثالیں بیان فرمائیں ہیں اسی طرح وہ دلائل بیان فرماتا ہے۔ پھر فرمایا: لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ یعنی جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا، استجاب بمعنی أجاب ہے شاعر نے کہا ہے:

فَلَمْ يَسْتَجِبْهُ عِندَ ذاكَ مُجِيبٌ

لم یستجبہ بمعنی لم یُجِبْهُ ہے۔

یعنی انہوں نے توحید اور نبوت وغیرہ میں سے جن کی طرف اللہ نے دعوت دی ہے ان کو مان لیا۔ الْحُسْنٰى کیونکہ یہ بات بھلائی کی انتہا میں ہے۔ ایک قول یہ ہے: الْحُسْنٰى سے مراد دنیا میں مدد اور کل باقی رہنے والی نعمت یعنی جنت ہے۔ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ یعنی اس پر ایمان لانے کو جنہوں نے نہیں مانا۔ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا یعنی مال وغیرہ میں سے وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ یعنی یہ ان کی ملکیت میں ہو۔ لَافْتَدَوْا بِهٖ قیامت کے دن کے عذاب کا فدیہ دیں، اس کی مثال سورۂ ''آل عمران'' میں ہے کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا (آل عمران: 10) بے شک جنہوں نے کفر اختیار کیا نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ (آل عمران: 91) جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لیے) عوضانہ دے اتنا سونا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ یعنی ان کی کسی نیکی کو قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے کسی گناہ سے صرف نظر کیا جائے گا۔ فرقد سبخی نے کہا کہ حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: اے فرقد! کیا تو جانتا ہے کہ سُوْٓءُ الْحِسَابِ کیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں! انہوں نے کہا: سُوْٓءُ الْحِسَابِ یہ ہے کہ آدمی کے تمام گناہوں کا حساب لیا جائے اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا جائے۔ وَمَاْوٰىهُمْ یعنی ان کا مسکن اور مقام جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی وہ بستر جو خود انہوں نے اپنے لیے تیار کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى

یہ ضرب المثل اللہ تعالیٰ نے مومن وکافر کے لیے بیان فرمائی ہے، روایت ہے کہ یہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور ابو جہل لعنۃ اللہ علیہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اَعْمٰى سے مراد دل کا اندھا ہے اور جو دین سے جاہل ہوتا ہے وہ دل کا اندھا ہے۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

''وہ جو پورا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو اور نہیں توڑتے پختہ وعدہ کو''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ یہ عقلمندوں کی صفت ہے یعنی نصیحت صرف وہی عقلمند قبول کرتے ہیں جو اللہ کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔ العهد اسم جنس ہے یعنی اللہ کے تمام وعدے اور وہ اس کے وہ اوامر اور نواہی ہیں جو اس نے اپنے بندوں کو فرمائے ہیں۔ ان الفاظ کے تحت تمام فرائض کا التزام اور تمام گناہوں سے بچنا شامل ہے۔ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد تو تمام وعدوں کی جنس مراد ہو یعنی جب وہ اللہ کی اطاعت میں کوئی وعدہ کرتے ہیں تو اس کو نہیں توڑتے۔ حضرت قتادہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے وعدوں کو توڑنے اور ان سے روکنے کے بارے میں بیس اور کچھ آیات اپنے بندوں کو دی ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کے ذریعے کسی معین وعدہ کی طرف اشارہ مقصود ہو، اور یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے اس وقت لیا تھا جب اس نے انہیں اپنے باپ آدم علیہ السلام کی صلب سے نکالا تھا۔ قفال نے کہا: اس سے مراد توحید و نبوت کے وہ دلائل ہیں جو اس نے بندوں کی عقل میں ڈال دیئے ہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابو داؤد اور دیگر لوگوں نے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ہم سات، آٹھ یا نو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت نہیں کرتے (1)؟'' اور ہم بیعت کے ذریعے عہد کے متعلق گفتگو کر رہے تھے تو ہم نے عرض کیا: ہم نے آپ کی بیعت کر لی ہے۔ آپ نے تین دفعہ یہ الفاظ ارشاد فرمائے، تو ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور آپ کی بیعت کر لی، ایک کہنے والے نے کہا: یا رسول اللہ! ہم نے آپ کی بیعت کر لی تھی تو ہم کس بات پر آپ کی بیعت کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، پانچ نمازیں پڑھو گے، توجہ سے سنو گے اور اطاعت کرو گے''۔ اور آپ نے رازداری سے ایک کلمہ ارشاد فرمایا۔ اور فرمایا ''لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کرو گے'' حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس جماعت کے کسی بندے کا چابک بھی گر جاتا تو وہ اسے بھی پکڑانے کے لیے کسی سے سوال نہ کرتا۔ ابن عربی نے کہا: نصیحت میں بڑے وعدوں میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے سوال نہ کیا جائے۔ حضرت ابو حمزہ خراسانی اللہ کے (نیک) بندوں میں سے تھے انہوں نے سنا کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر بیعت کی ہے کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے، تو ابو حمزہ نے کہا: اے پروردگار! ان لوگوں نے تو تیرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو یہ وعدہ کیا میں تیرے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ کسی سے کچھ بھی نہیں مانگوں گا۔ شام سے مکہ کی طرف حج کے ارادے سے نکلے رات کے وقت راستے میں چل رہے تھے کہ اپنے دوستوں سے کسی عذر کی وجہ سے پیچھے رہ گئے پھر ان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، اسی دوران راستے کے کنارے پر واقع ایک کنوئے میں گر گئے۔ جب کنوئے کے چیندے میں پہنچے تو سوچا کہ کسی سے مدد طلب

1۔ سنن ابن ماجہ، باب البیعۃ، صفحہ 398، حدیث 2867۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 1399، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کروں ہو سکتا ہے کوئی سن لے۔ پھر سوچا کہ جس کے ساتھ میں نے عہد کیا ہوا ہے وہ مجھے دیکھ بھی رہا ہے اور سن بھی رہا ہے، اللہ کی قسم! کسی انسان کے لیے ایک حرف بھی نہیں بولوں گا، پھر تھوڑی ہی دیر گزری کہ اس کنویں سے ایک وفد گزرا جب انہوں نے کنویں کو راستے کے کنارے پر دیکھا تو انہوں نے کہا: اس کنویں کو بند کر دینا چاہیے، انہوں نے لکڑیاں کاٹیں اور انہیں کنویں کے منہ پر رکھ کر مٹی کے ساتھ انہیں ڈھانپ دیا، جب ابوحمزہ نے یہ دیکھا تو سوچا: یہ تو ہلاکت گاہ ہے، پھر لوگوں سے مدد طلب کرنا چاہی مگر کہا: اللہ کی قسم! میں کبھی بھی اس عہد سے نہیں نکلوں گا، پھر اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: کیا تو نے اس کے ساتھ عہد نہیں کر رکھا جو تجھے دیکھ رہا ہے؟ پس خاموش ہو گئے اور توکل کر لیا، پھر اپنے معاملہ میں غور و فکر کرتے ہوئے کنویں کے پیندے میں ٹیک لگائی تو اچانک مٹی پڑی اور لکڑی اوپر اٹھ گئی اور اسی دوران کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اپنا ہاتھ لاؤ! ابوحمزہ نے کہا: میں نے اسے اپنا ہاتھ دے دیا تو اس نے ایک جست میں مجھے کنویں کے کنارے پر پہنچا دیا، باہر نکلا تو کسی کو بھی نہ پایا، غیب سے آواز سنی جو کہہ رہا تھا: تو نے توکل کا پھل کیسا پایا؟ تو ابوحمزہ نے یہ اشعار کہے:

نهانِي حيائي منك أن أكشفَ الهوى فأغنيتَني بالعلم منكَ عن الكَشْف

تَلَطَّفْتَ لي امري فأبديت شاهدي إلى غائبي واللطفُ يُدرَكُ باللُّطفِ

تراءيتَ لِي بالعلم حتّى كأنما تُخبِرُنِي بالغيب أَنَّكَ في كَفِّ

أرانِي وبي من هَيْبَتي لكَ وَحْشَةٌ فتونِسُنِي باللُّطفِ مِنكَ وبالعطفِ

وتُحيِي مُحِبّاً أنتَ في الحبِّ حَتْفُهُ وذَا عَجبٌ كيف الحياةُ مَعَ الحَتْفِ

ابن عربی نے کہا(1): یہ ہے وہ آدمی جس نے اللہ کے ساتھ عہد کیا تو اسے تمام و کمل پورا کیا، پس اس کی اقتدا کرو انشاء اللہ ہدایت پا جاؤ گے۔ ابوالفرج جوزی نے کہا: اس آدمی نے اس مقام پر بزعم خویش جو توکل اختیار کیا یہ درست نہیں۔ اگر وہ توکل کا معنی سمجھ لیتا تو اسے پتہ چل جاتا کہ اس حالت میں کسی سے مدد طلب کرنا توکل کے منافی نہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے چھپ کر نکلنا توکل سے خارج نہیں پھر آپ کا کوئی حیلہ سوچنا، اس معاملہ کا پوشیدہ رکھنا اور اپنے آپ کو غار میں چھپانا اور سراقہ کو اخفِ عنا کے الفاظ ارشاد فرمانا (توکل کے منافی نہیں) پس وہ توکل جو قابل تعریف ہے وہ کسی ممنوع فعل کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور کنویں میں یہ صورت اختیار کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے لیے آلات پیدا فرمائے ہیں جن کے ذریعے وہ ضرر کو دور کر سکتا ہے اور ایسے آلات بھی پیدا فرمائے ہیں جن کے ذریعے وہ نفع حاصل کر سکتا ہے، اگر وہ ان آلات کو توکل کا دعویٰ کرتے ہوئے معطل کر دے تو یہ اس کی توکل سے عدم واقفیت اور تواضع کی حکمت کی تردید پر دلیل ہے، کیونکہ توکل تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر دل کے اعتماد کا نام ہے اور اسباب کو ختم کر دینا توکل کی ضروریات میں سے نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی بھوکا ہو اور کسی سے کچھ نہ مانگے اور مر جائے تو جہنم میں جائے گا، یہ حضرت سفیان ثوری اور دیگر لوگوں کا قول ہے، کیونکہ اسلام کے طریقوں کی جانب اس کی رہنمائی کی گئی ہے، اب اگر اس

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 3، صفحہ 1112

نے وہ طریقے اختیار نہیں کیے تو خود اپنے قتل پر اپنی معاونت کی ہے۔ ابوالفرج نے کہا: ابوحمزہ کے قول فَجَاءَ اَسَدٌ فَاَخْرَجَنِی (شیر آیا تو اس نے مجھے نکالا) قابل التفات نہیں کیونکہ اگر یہ صحیح بھی ہو تب بھی ایسا اتفاقاً ہوا ہے اور ایک جاہل آدمی پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہوئی ہے اور اس کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ مہربانی کی ہوگی، انکار تو اس کے اپنے فعل کا ہے جو اس نے کیا، کیونکہ اس کا اپنا فعل خود اس کی اپنی جان کے قتل پر معاونت تھی جو جان اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت تھی اور اللہ نے اسے اس کی حفاظت کا حکم فرما رکھا تھا۔

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿21﴾ وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿22﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓىٕكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿23﴾ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿24﴾

"اور جو لوگ جوڑتے ہیں اسے جس کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ جوڑا جائے اور ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے اور خائف رہتے ہیں سخت حساب سے۔ اور جو لوگ (مصائب و آلام میں) صبر کرتے رہے اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور خرچ کرتے رہے اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر اور مدافعت کرتے رہتے ہیں نیکی سے برائی کی انہیں لوگوں کے لیے دار آخرت کی راحتیں ہیں (یعنی) سدا بہار باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور جو صالح ہوں گے ان کے باپ دادوں، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے (وہ بھی داخل ہوں گے) اور فرشتے (یہ کہتے ہوئے) داخل ہوں گے ان پر ہر دروازہ سے: سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا پس کیا عمدہ ہے یہ آخرت کا گھر"۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ حضرت قتادہ اور اکثر مفسرین کے نزدیک یہ صلہ رحمی کے بارے میں ظاہر ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تمام علامات کو بھی شامل ہے۔ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ایک قول یہ ہے: قطع رحم کے بارے میں وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جبکہ ایک قول کے مطابق تمام نافرمانیوں اور گناہوں سے ڈرتے ہیں۔ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ، سُوْٓءَ الْحِسَابِ سے مراد یہ ہے کہ حساب میں سختی اور مناقشہ کیا جائے گا اور جس سے تفصیلی حساب سختی سے لیا گیا اسے عذاب دیا (ہی) جائے گا۔ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ کا معنی تمام کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ حضرت حسن نے کہا: یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلہ رحمی کے بارے میں ہے اور چوتھا احتمال یہ بھی ہے کہ نیک عمل کے ساتھ ایمان پر کاربند رہیں (1)، وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ اور ایسے معاملات کے بارے میں

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 108

اپنے رب سے ڈرتے ہیں جن کو بجالانے کا اس نے انہیں حکم دیا ہے۔ وَيَخَافُونَ سُوٓءَ الْحِسَابِ ان معاملات کو چھوڑنے کے حوالے سے حساب کی سختی سے ڈرتے ہیں؛ پہلا قول ان سب اقوال کو شامل ہے۔ باللہ توفیقنا۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ ایک قول کے مطابق یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ صَبَرُوا فعل ماضی ہے لہٰذا یوفون پر اس کا عطف نہیں ہوسکتا۔ اور ایک قول یہ ہے: یہ بھی گزشتہ لوگوں کی ہی صفت ہے۔ اور صفت کبھی لفظ ماضی کے ساتھ جائز ہوتی ہے اور کبھی مضارع کے لفظ کے ساتھ، کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا من یفعل کذا فلہ کذا جو ایسا کرے گا تو اس کے لیے ایسا ہوگا۔ جب وَالَّذِيْنَ متضمن بمعنی شرط ہے اور شرط میں ماضی، مضارع کے معنی میں ہوتی ہے تو ایسا جائز اور درست ہوگا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ فرمایا پھر وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا فرمایا اور پھر اس پر عطف کرتے ہوئے يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ فرمایا ہے۔ ابن زید نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کیا اور اللہ کی نافرمانی سے صبر کیا۔ عطا نے کہا: انہوں نے مصائب و آلام اور حوادث و نوائب پر صبر کیا۔ ابو عمران جونی نے کہا: جنہوں نے اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنے دین پر صبر کیا۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ یعنی انہوں نے نمازوں کو ان کے فرائض سمیت اور ان کے اوقات میں خشوع و خضوع سے ادا کیا۔ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ اس کے بارے میں سورۂ ''بقرہ'' میں تفصیلی گفتگو گزر چکی ہے۔ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ یعنی وہ برے اعمال کو نیک اعمال کے ذریعے رد کرتے ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ ابن زید نے کہا: بھلائی کے ذریعے برائی کو روکتے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر کے نزدیک نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرتے ہیں۔ ضحاک نے کہا: سلام کے ذریعے فحش کو دور کرتے ہیں۔ جو یبر نے کہا: عفو کے ذریعے ظلم کو روکتے ہیں۔ ابن شجرہ نے کہا: توبہ کے ذریعے گناہ کو دور کرتے ہیں۔ قتیبی نے کہا: بردباری کے ذریعے جاہل کی بے وقوفی کو روکتے ہیں اور بے وقوفی سے مراد برائی اور بردباری سے مراد نیکی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جب وہ گناہ کا ارادہ کرتے ہیں تو اس سے رجوع کر لیتے ہیں اور استغفار کرتے ہیں، جبکہ ایک قول کے مطابق: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی کے ذریعے وہ شرک کو دور کرتے ہیں۔ یہ اقوال ہیں اور تمام کا معنی قریب قریب ہے، پہلا معنی بالعموم سب کو شامل ہے اور اس کی مثال: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود: 114) ہے (بے شک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں) اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کیلئے ارشاد ہے: أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ (1) گناہ کے بعد نیکی کر یہ اس کو مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھی طرح معاملہ کر۔

قولہ تعالیٰ: اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی آخرت کی عاقبت اور وہ دوزخ کے بدلے میں جنت ہے۔ اور مستقبل میں دار دو ہی ہوں گے، فرماں بردار کے لیے جنت اور نافرمان کے لیے دوزخ، پس جب اطاعت گزاروں کی صفات کو بیان فرمایا تو لامحالہ طور پر ان کا دار جنت ہی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: دار سے مراد دار دنیا ہے، یعنی جو انہوں نے اطاعت و فرمانبرداری والے کام کیے ہیں ان کی جزا انہیں دار دنیا میں ہی مل جائے گی۔

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی معاشرۃ الناس، حدیث 1910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا یعنی ان کے لیے سدابہار باغات ہیں، جَنّٰتُ عَدۡنٍ، عُقۡبَی سے بدل ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عُقۡبَی الدَّارِ کی تفسیر ہو یعنی لھم دخول جنّاتِ عدنٍ کیوں کہ عُقۡبَی الدَّارِ حدث ہے اور جَنّٰتُ عَدۡنٍ عین، اور حدث اپنے جیسے حدث کی تفسیر بیان کرتا ہے، پس محذوف مصدر مفعول کی طرف مضاف ہوگا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جَنّٰتُ عَدۡنٍ مبتدا محذوف کی خبر ہو اور جَنّٰتُ عَدۡنٍ جنت کا درمیانی اور سب سے بڑا حصہ ہے، اور اس کی چھت رحمن کا عرش ہے۔ یہ ابونصر عبدالرحیم قشیری کا قول ہے اور صحیح بخاری میں ہے(1): ”جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس کا سوال کرو بے شک یہ اوسط الجنۃ اور اعلی الجنۃ ہے، اس کے اوپر رحمن کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں“۔ ہوسکتا ہے جَنّٰتُ عَدۡنٍ بھی اسی طرح ہو، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جنت میں ایک محل ہے جسے عدن کہا جاتا ہے اس کے اردگرد بروج اور مروج ہیں، اس میں ایک ہزار دروازہ ہے، ہر دروازے پر پانچ ہزار یمنی منقش چادریں ہیں اس میں صرف نبی، صدیق اور شہید ہی داخل ہوسکتے ہیں۔ عَدۡنٍ، عَدَن بالمکان سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی مکان میں مقیم ہوجائے، اس کا بیان انشاء اللہ سورۂ ”کہف“ میں آئے گا۔ وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَ اَزۡوَاجِهِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِهِمۡ، اُولٰٓئِکَ پر اس کا عطف بھی ہوسکتا ہے، معنی ہوگا أولئك ومن صلح من آبائهم وأزواجهم وذرياتهم لهم عقبى الدار اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یَدۡخُلُوۡنَ میں ضمیر مرفوع پر اس کا عطف ہو اور یہ عطف صحیح وعمدہ بھی ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان ضمیر منصوب حائل ہے اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے: يدخلونها ويدخلها من صلح من آبائهم یعنی وہ جو نیک ہو، اور نام ونسب کی وجہ سے وہ داخل نہیں ہوں گے، اور ”من“ محل نصب میں بھی ہوسکتا ہے تقدیر عبارت یہ ہوگی: وہ ان نیکوں کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے اگرچہ ان کے اعمال ان کی طرح نہیں ہوں گے مگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کی عزت کی وجہ سے انہیں بھی ملا دے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ صلاح یا نیکی، اللہ اور رسول پر ایمان لانا ہے اور اگر ان کے پاس ایمان کے ساتھ ساتھ دیگر نیکیاں بھی ہوں گی تو وہ اپنی طاعات کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے نہ کہ ان کے تابع ہونے کی وجہ سے۔ قشیری نے کہا: اس میں نظر ہے کیونکہ ایمان تو ضروری ہے، پس عمل صالح کی شرط کا قول ایسا ہی ہے جیسا کہ ایمان کی شرط کا قول ہے۔

اظہر یہ ہے کہ یہ صلاح تمام اعمال میں ہے اور معنی یہ ہوگا کہ کل بروز قیامت ان پر نعمت اس طرح مکمل ہوگی کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سمیت جنت میں جمع ہوں گے، اور ہر انسان اپنے ذاتی عمل کے ذریعے جنت میں داخل نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ جنت جائے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر مہربانی کرتے ہوئے ہدایا اور تحائف کے ساتھ فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے آئیں گے۔ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ یعنی وہ کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ، قول کو مضمر کردیا یعنی تم آفات اور ابتلاء سے سلامت ہو۔ ایک قول یہ ہے: اگرچہ وہ سلامت اور محفوظ ہیں تاہم یہ ان کے لیے ہمیشہ کی سلامتی کی دعا ہے؛ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت رکھے گا، یہ خبر ہے اور اس کا معنی دعا ہے، اور عبودیت کے اعتراف کو متضمن

1۔ صحیح بخاری، کتاب الرد علی الجھمیۃ، جلد 2، صفحہ 1104

ہے۔ بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی بصبرکم، ما فعل کے ساتھ آئے تو فعل مصدری معنی میں ہوجاتا ہے اور ما کے ساتھ آنے والی با، سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ کے متعلق ہوگی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ محذوف کے متعلق ہو یعنی ھذہ الکرامۃ بصبرکم یہ عزت تمہارے صبر کی وجہ سے ہے، یعنی جو الله کے امر اور نہی پر تم نے صبر کیا (1)، یہ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق اس سے دنیا میں فقر پر صبر مراد ہے۔ یہ ابو عمران جونی کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: الله کے راستے میں جہاد پر صبر، جس طرح کہ حضرت عبدالله بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ الله کی مخلوق میں سے کون جنت میں داخل ہوگا؟'' صحابہ نے عرض کیا: الله اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ''وہ مجاہد جن کے ذریعے سرحدیں محفوظ ہوتی ہیں اور جن کے ذریعے ناپسندیدہ کاموں سے بچا جاتا ہے جب ان میں سے کوئی فوت ہوتا ہے اور خود اپنی حاجت کو پورا نہیں کرسکتا تو فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے داخل ہوتے ہیں کہ تم پر تمہارے صبر کی وجہ سے سلامتی ہو پس یہ آخرت کا گھر کیا عمدہ ہے''۔ محمد بن ابراہیم نے کہا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال کے آخر میں شہداء کی قبور پر آتے اور فرماتے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یہی معمول حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کا تھا۔ بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کے پاس آتے، جب دو پہاڑوں کے درمیان گھاٹی میں پہنچتے تو فرماتے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسا کرتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایسا کرتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی دنیا کی فضولیات سے۔ ایک قول یہ ہے: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی طاعت کی ملازمت اور معصیت کی مفارقت پر، یہ معنی فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔ ابن زید نے کہا: بِمَا صَبَرْتُمْ یعنی جب کوئی ایسی چیز تم سے بچھڑ جاتی جس کے ساتھ تم محبت کرتے ہوتے تو اس پر صبر۔ اور بِمَا صَبَرْتُمْ کا ساتواں احتمال یہ ہے کہ شہوات کی اتباع سے صبر۔ حضرت عبدالله بن سلام اور حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: جب قیامت کا دن ہوگا تو پکارنے والا پکارے گا کہ صبر والے کھڑے ہو جائیں، تو لوگوں میں سے کچھ کھڑے ہوں گے انہیں کہا جائے گا: تم جنت کی طرف چلے جاؤ، تو فرشتے انہیں ملیں گے اور کہیں گے: کدھر جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کی طرف، فرشتے کہیں گے: حساب سے پہلے؟ وہ کہیں گے: ہاں! فرشتے کہیں گے: تم کون ہو؟ تو وہ کہیں گے: ہم صبر والے ہیں، فرشتے کہیں گے: تمہارا صبر کیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہم نے الله کی طاعت پر اپنے نفس کو صابر رکھا، الله کی نافرمانی سے اسے صابر رکھا اور دنیا میں آزمائش اور امتحان میں اسے صابر رکھا۔ حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: فرشتے انہیں کہیں گے: جنت میں داخل ہو جاؤ عمل کرنے والوں کا کتنا عمدہ اجر ہے۔ ابن سلام نے کہا: فرشتے انہیں کہیں گے: سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ۔ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ یعنی دار آخرت جس میں تم ہو یہ کتنا عمدہ ہے، اس میں تم نے وہی کام کیا جو تم اس سے پہلے والے دار میں کرتے رہے: عُقْبَى اسی بنیاد پر اسم ہے اور الدَّارِ یہ دنیا ہے۔ ابو عمران جونی نے کہا: فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ یعنی جنت، دوزخ کی نسبت

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 109

کتنا عمدہ گھر ہے اور انہیں سے مروی ہے: فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ یعنی جنت، دنیا کی نسبت کتنا عمدہ گھر ہے (1)۔

وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰۤـئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اَللّٰهُ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ وَفَرِحُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا فِى الۡاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

''اور وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ (سے کیے ہوئے) وعدہ کو اسے پختہ کرنے کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ انہیں جوڑا جائے اور (فتنہ و) فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یہی لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تنگ روزی دیتا ہے (جسے چاہتا ہے) اور کفار بڑے مسرور ہیں دنیوی زندگی (کی راحتوں) سے اور (حقیقت یہ ہے کہ) نہیں دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں مگر متاع حقیر''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ جب اللہ تعالیٰ اپنے عہد کو پورا کرنے والوں اور اپنے حکم پر عمل پیرا ہونے والوں کا ذکر فرما چکا تو اب ان کا ذکر فرما رہا ہے جو ان کے برعکس ہیں۔ ''نقض المیثاق'' سے مراد اس کے حکم کا ترک ہے۔ ایک قول یہ ہے: اپنے عقلوں کو مہمل چھوڑ دینا مراد ہے، کہ وہ عقل کے ذریعے تدبر نہیں کرتے تا کہ اللہ کو پہچان لیں۔ وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ یعنی قطع تعلق کرتے ہیں اور تمام انبیاء پر ایمان لانے کے عہد کو قطع کرتے ہیں۔ وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ یعنی کفر اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اُولٰۤـئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ یعنی رحمت سے دوری اور محرومی۔ وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ اس سے مراد سوء المنقلب ہے اور وہ جہنم ہے۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں! یہ آزاد لوگ ہیں۔

قولہ تعالیٰ: اَللّٰهُ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ جب اللہ تعالیٰ نے مومن و کافر کے انجام کو ذکر فرمایا تو پھر یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں رزق کو کشادہ بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کیونکہ یہ دار الامتحان ہے، پس کافر پر رزق کی کشادگی اس کی عزت کی دلیل نہیں اور نہ ہی کسی مومن پر رزق کی تنگی اس کی اہانت کی دلیل ہے۔ يَقۡدِرُ کا معنی ''یضیق'' ہے یعنی وہ تنگ کرتا ہے۔ اسی سے وَمَنۡ قُدِرَ عَلَيۡهِ رِزۡقُهٗ (الطلاق: 7) ہے یعنی اس نے تنگ کیا اور ایک قول کے مطابق يَقۡدِرُ سے مراد یہ ہے کہ وہ ضرورت کی مقدار عطا فرماتا ہے۔ وَفَرِحُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا یعنی مشرکین مکہ دنیا پر خوش ہیں اور اس کے علاوہ سے واقف نہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس سے جاہل ہیں۔ یہ يُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ پر معطوف ہے۔ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر عبارت یہ ہے: والذين ينقضون عهد الله من بعد ميثاقه ويقطعون ما أمر الله به أن يوصل

1۔ تفسیر ماوردی، جلد 3، صفحہ 109

ویفسدون فی الأرض وفرحوا بالحیاۃ الدنیا۔

وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ ، فِی الْاٰخِرَةِ سے مراد فی جنب الاخرۃ ہے یعنی آخرت کے پہلو میں اِلَّا مَتَاعٌ یعنی متاع من الأمتعۃ جس طرح پیالا اور وہ چھوٹا برتن جس میں سالن کھایا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا: تھوڑی چیز جو چلی جانے والی ہے، دن چڑھا تو اسے زوال لازمی آئے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اس طرح کا زادرہ ہے جس طرح ایک چرواہے کے پاس زادراہ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: متاع الحیاۃ الدنیا سے مراد دنیوی زندگی کا وہ حصہ ہے جس سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق: اس سے مراد تقویٰ اور نیک عمل میں سے جو اس دنیا سے آخرت کی طرف بطور زادراہ لے جاتا ہے وہ ہے۔

وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ ۚۖ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾

"اور کفار کہتے ہیں: (اگر یہ سچے نبی ہیں) تو کیوں نہ اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے، آپ فرمایئے: (نشانیاں تو بہت ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور رہنمائی فرماتا ہے اپنی (بارگاہ قرب کی) طرف جو صدق دل سے رجوع کرتا ہے (یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکر الٰہی سے دھیان سے سنو! اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں"۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر واضح فرمادیا ہے کہ کفار کا سچائی پر دلالت کرنے والی ایک نشانی کو دیکھ لینے کے بعد رسولوں پر کئی نشانیوں کو پیش کرنے کا مطالب جہالت پر مبنی ہے اور یہ کہنے والے عبداللہ بن ابی امیہ اور اس کے وہ ساتھی ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نشانیوں کا مطالبہ کیا۔ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ عزوجل یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ یعنی جس طرح اس نے کئی آیات کے نزول کے بعد تمہیں گمراہ کیا اور ان سے استدلال سے تمہیں محروم رکھا اسی طرح وہ ان کے علاوہ کئی آیات کے نزول کے وقت تمہیں گمراہ کرے گا۔ وَ یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ ۔ اَنَابَ سے مراد ہے جس نے رجوع کیا۔ اور اِلَیْهِ کی ضمیر حق، اسلام یا اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے یعنی وہ اپنے دین اور اطاعت کی طرف اسے ہدایت دیتا ہے جو اپنے دل کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق اِلَیْهِ کی ضمیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، اَلَّذِیْنَ مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے؛ یعنی یہدی اللہ الذین آمنوا اور ایک قول یہ ہے کہ یہ مَنْ اَنَابَ کے ارشاد سے بدل ہے۔ وہ بھی محل نصب میں ہے۔ وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کے ذریعے سکون پذیر اور مانوس ہوتے ہیں تو مطمئن ہو جاتے ہیں، یعنی وہ اپنی زبانوں کے ذریعے اللہ کا ذکر کر کے ہمیشہ اپنے دلوں کو اطمینان دیتے ہیں، یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مجاہد اور قتادہ وغیرہ نے کہا: ذکر سے مراد قرآن ہے۔ حضرت

سفیان بن عیینہ نے کہا: اس سے مراد اللہ کا امر ہے۔ مقاتل کے نزدیک اللہ کا وعدہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس کے نام کی قسم ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے فضل و انعام کے ذکر کے ذریعے وہ اطمینان حاصل کرتے ہیں، جس طرح اس کے عدل، انتقام اور قضا کے ذکر سے کانپتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے بِذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی آیات میں غور وفکر کرتے ہیں تو بصیرت سے اس کی قدرت کے کمال کو پہچانتے ہیں۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ یعنی مومنین کے دل۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا تعلق قسم کے ساتھ ہے، جب مد مقابل اللہ کے نام کی قسم اٹھاتا ہے تو بندہ مومن کا دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: بِذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: اس سے اللہ کا ثواب مراد ہے۔ ایک قول کے مطابق اللہ کا وعدہ مراد ہے۔ مجاہد نے کہا: یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل (بھی) نیک کیے مژدہ ہو ان کے لیے اور (انہی کے لیے) اچھا انجام ہے''۔

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ مبتدا اور خبر ہے ایک قول یہ ہے: اس کا معنی لَهُمْ طُوْبٰى ہے، طُوْبٰى مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محل نصب میں ہو اس صورت میں تقدیر عبارت: جَعَلَ لَهُمْ طُوْبٰى ہوگی اور مذکورہ دونوں صورتوں میں وَ حُسْنُ مَاٰبٍ کا اس پر عطف ہوگا، تو اس کو رفع بھی دیا جا سکتا ہے اور نصب بھی۔

عبد الرزاق نے ذکر کیا: ہمیں معمر نے عن یحییٰ بن ابی کثیر عن عمرو بن ابی یزید بکالی عن عتبہ بن عبد السلمی بیان کیا ہے انہوں نے کہا: ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے آپ سے جنت اور حوض کوثر کے بارے میں پوچھا اس نے کہا: کیا اس میں پھل ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں ایک درخت ہے جسے طوبیٰ کہا جاتا ہے''۔ اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہماری زمین میں کون سا درخت اس کے مشابہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''تیری زمین کے درختوں میں سے کوئی بھی اس کے مشابہ نہیں کیا تو شام گیا ہے وہاں ایک درخت ہے جسے ''جوزہ'' کہا جاتا ہے جو تنے پر اگتا ہے اور اپنے اوپر والے حصے کو پھیلا دیتا ہے''۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس کے تنے کی موٹائی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں میں سے جذعۃ کے ساتھ سفر کرے تو تب بھی تو اس کے تنے کا احاطہ نہیں کر سکتا یہاں تک کہ بڑھاپے کے سبب اس کی ہنسلی کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں''۔ اور راوی نے حدیث ذکر کی، اور ہم نے اسے ''التذکرہ'' میں ''ابواب الجنۃ'' میں مکمل طور پر لکھ دیا ہے۔ والحمد للہ۔

ابن مبارک نے ذکر کیا اور کہا: أخبرنا معمر عن الأشعث عن عبد اللہ عن شھر بن حوشب عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ آپ نے فرمایا: جنت میں ایک درخت ہے اسے ''طوبیٰ'' کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے وہ پیدا کر جو یہ چاہے تو وہ اس کے لیے زین، لگام اور اس کی ہیئت سمیت ایک گھوڑا پیدا کرے گا جس طرح وہ چاہے گا، اور سواری والے جانور سے کجاوے، مہار اور اس کی ہیئت سمیت پیدا کرے گا جو وہ چاہے گا یعنی خالص حصے اور کپڑے۔

حضرت ابن وہب نے شہر بن حوشب والی حدیث حضرت ابو امامہ باہلی سے روایت کی ہے آپ نے کہا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے ہر گھر میں اس کی کوئی نہ کوئی ٹہنی ہوگی، کوئی خوبصورت پرندہ نہیں جو اس میں نہ ہو اور نہ ہی کوئی پھل ہے جو اس

میں نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے: اس کی اصل جنت میں نبی کریم ﷺ کے محل میں ہوگی، پھر اس کی ٹہنیاں اہل جنت کے گھروں میں تقسیم ہوں گی جس طرح تمام اہل دنیا میں آپ کی بارگاہ سے علم اور ایمان پھیلتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: طُوْبٰى لَهُمْ کا مطلب ہے کہ ان کے لیے خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ آپ ہی سے مروی ہے کہ طوبیٰ حبشی زبان میں جنت کا نام ہے، یہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے۔

حضرت ربیع بن انس نے کہا: ہندی زبان میں یہ باغ ہے، قشیری نے کہا: اگر یہ صحیح ہے تو پھر یہ دو زبانوں کو جوڑتا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا: طُوْبٰى لَهُمْ یعنی ان کے لیے بھلائی ہے۔ عکرمہ نے کہا: ان کے لیے نعمت ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی نے کہا: ان کے لیے بہتری ہے، انہیں سے مروی ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے عزت ہے۔ ضحاک نے کہا: ان کے لیے خوشی و سرور ہے۔ نحاس نے کہا: یہ سارے اقوال قریب قریب ہیں، کیونکہ ''طُوبیٰ'' طیب سے فعلیٰ کا وزن ہے، یعنی ان کے لیے پاکیزہ زندگی ہوگی اور یہ ساری چیزیں پاکیزہ چیز کی طرف ہی راجع ہیں۔ زجاج نے کہا: ''طوبیٰ'' طیب سے فُعلیٰ کا وزن ہے، اور یہ ان کی پاکیزگی کی حالت ہے، اس کی اصل طُیبیٰ ہے، ''یا'' ساکن ماقبل مضموم واو سے بدل گئی جس طرح کہ: موسِرٌ اور موقن۔

میں (قرطبی) نے کہا: صحیح بات یہ ہے کہ یہ درخت ہے، اس کی دلیل ہماری ذکر کردہ مرفوع حدیث ہے، یہ روایت سہیلی کی ذکر کردہ شرائط کے مطابق صحیح ہے، اس کو ابو عمر نے ''التمہید'' میں ذکر کیا ہے، اور اسی سے ہم نے اسے نقل کیا ہے۔ اسی طرح ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اسے ذکر کیا ہے۔ المہدوی اور قشیری نے بھی اسے معاویہ بن قرۃ عن ابیہ راویت کیا ہے (1) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست (قدرت) سے لگایا اور اس میں اپنی روح پھونکی زیورات اور حلّے اگاتا ہے اور اس کی ٹہنیاں جنت کی دیواروں کے پیچھے سے دکھائی دیتی ہیں۔'' جو اس سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ثعلبی کا مطالعہ کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''طوبیٰ'' جنت میں ایک درخت ہے اس کی اصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں ہے اور ہر مومن کے گھر میں اس کی ایک ٹہنی ہے۔ حضرت ابو جعفر محمد بن علی نے کہا: نبی کریم ﷺ سے طُوْبٰى لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''یہ ایک درخت ہے جس کی اصل میرے گھر میں اور اس کی ٹہنیاں جنت میں ہیں''۔ آپ کو عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! آپ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: اصلھا فی دار علی وفرعھا فی الجنة۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کل جنت میں میرا گھر اور علی کا گھر ایک ہی جگہ پر ایک ہی ہوگا''۔ آپ ﷺ سے ہی مروی ہے: ''یہ ایک درخت ہے جس کی اصل میرے گھر میں ہے اور تم میں سے ہر ایک کے گھر میں اس کی ٹہنی لٹکی ہوئی ہے''۔ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ جب کوئی واپس لوٹے تو ''آب'' کہا جاتا ہے۔ ایک قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہوگا: الذین آمنوا وتطمئن قلوبهم بذكر الله وعملوا الصالحات طوبى لهم۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ

1۔ معالم التنزیل، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 354

اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ مَتَابِ ۝

''اسی طرح ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ایک قوم میں جس سے پہلے گزر چکی ہیں کئی قومیں تاکہ آپ پڑھ کر سنائیں انہیں وہ (کلام) جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا اور یہ کفار انکار کر رہے ہیں رحمن کا، فرمایئے: وہی میرا پروردگار ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اسی پر ہی میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی جناب میں رجوع کیے ہوں''۔

قولہ تعالیٰ: كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ یعنی ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا جس طرح آپ سے پہلے انبیاء کو بھیجا، یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ ایک قول یہ ہے: جس کی طرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا گیا اس پر ہونے والے انعام کو اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر ہونے والے انعام کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس کی طرف آپ سے پہلے انبیاء کو بھیجا گیا۔ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ یعنی قرآن وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ مقاتل اور ابن جریج نے کہا: یہ صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی جب انہوں نے کتاب الصلح لکھنا چاہی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا(1): بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھو'' سہیل بن عمرو اور مشرکین نے کہا: ہم سوائے صاحب یمامہ کے رحمن کو نہیں جانتے، صاحب یمامہ سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھا، لہٰذا اکتب باسمك اللهم اسی طرح زمانہ جاہلیت میں لوگ لکھتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''یہ لکھو جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح ہوئی ہے''(2)۔ قریش کے مشرکین نے کہا: اگر آپ رسول تھے تو ہم نے آپ کے ساتھ جنگ کی اور تیرا راستہ روکا تو گویا ہم نے آپ کے ساتھ ظلم کیا ہے، (وہ نہ لکھو) بلکہ یہ لکھو: یہ ہے جس پر محمد بن عبداللہ نے صلح کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے کہا: ہمیں چھوڑ دیجیے ہم ان کے ساتھ جنگ کریں گے، آپ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ وہ لکھو جو یہ چاہتے ہیں''۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ قریش کفار کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اسجدوا للرحمن رحمن کو سجدہ کرو۔ تو انہوں نے کہا: رحمن کون ہے؟ تو یہ حکم نازل ہوا کہ قُلْ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! جنہوں نے آپ کا انکار کیا ہے انہیں فرمایئے هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اگرچہ اس کے صفاتی نام مختلف ہیں۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ یعنی میں نے اعتماد اور بھروسہ کیا وَ اِلَيْهِ مَتَابِ یعنی کل میرا لوٹنا اسی کی طرف ہوگا اور آج بھی میں نے اسی پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے میں اس کی قضا پر راضی اور اس کے حکم کو تسلیم کرتا ہوں۔ ایک قول یہ بھی ہے: ابو جہل نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر میں یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ اے رحمٰن تو اس نے کہا: محمد ہمیں کئی معبودوں کی عبادت سے روکتا ہے اور خود دو معبودوں کو پکارتا ہے، تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ بھی نازل ہوئی قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (الاسراء: 110)

وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ

1۔ کنز العمال، غزوۂ حدیبیہ، جلد 10، صفحہ 480، حدیث 3151 2۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 1، صفحہ 342

الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ لَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

”اور اگر کوئی ایسا قرآن اترتا جس کے ذریعے سے پہاڑ چلنے لگتے یا اس کے اثر سے پھٹ جاتی زمین یا مردوں سے اس کے ذریعہ بات کی جا سکتی (یہ قدرت سے بعید نہ تھا) بلکہ سب کام اللہ کے اختیار میں ہیں (بایں ہمہ وہ ایمان نہ لاتے) کیا نہیں جانتے ایمان والے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ ور کفار اس حالت میں رہیں گے کہ پہنچتا رہے گا انہیں (آئے دن) اپنے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی صدمہ یا اترتی رہے گی کوئی نہ کوئی مصیبت ان کے گھروں کے گردونواح میں یہاں تک کہ آ جائے اللہ کے وعدہ (کے ظہور کا دن) بے شک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا“۔

قولہ تعالیٰ: وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ کے ساتھ متصل ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مشرکین مکہ کا ایک گروہ جس میں ابوجہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ مخزومی بھی تھے کعبہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، پھر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا آپ ان کے پاس آئے تو عبد اللہ نے آپ کو کہا: اگر آپ کو یہ بات خوش کرتی ہے کہ ہم آپ کی اتباع کریں تو قرآن کے ذریعے ہمارے پہاڑ کو چلا، اس کو ہم سے دور لے جا یہاں تک کہ یہ پھٹ جائے، یہ تنگ زمین ہے اور اس میں ہمارے لیے چشمے اور نہریں بنادے تاکہ ہم اس میں درخت لگائیں اور فصلیں کاشت کریں، آپ کے خیال کے مطابق آپ اپنے رب کے نزدیک داؤد سے زیادہ کمزور نہیں ہیں کہ ان کے لیے اللہ نے پہاڑوں کو مسخر کیا وہ ان کے ساتھ چلتے تھے۔ اور ہمارے لیے ہوا کو مسخر کرو، ہم ان پر سوار ہو کر شام کو جائیں اسی پر اپنی ضروریات اور کام کریں، پھر آج ہی واپس لوٹ آئیں، آپ کے خیال کے مطابق سلیمان کے لیے ہوا مسخر تھی آپ اپنے رب کے نزدیک سلیمان بن داؤد سے زیادہ کمزور نہیں۔ ہمارے لیے اپنے دادا کی پرانی ہڈی کو زندہ کیجیے یا ہمارے مردوں میں سے جس کو چاہو زندہ کردو تاکہ ہم اس سے سوال و جواب کریں کہ کیا جو کچھ آپ کہتے ہیں یہ حق ہے یا باطل؟ عیسیٰ (علیہ السلام) مردوں کو زندہ کرتے تھے، اور آپ اپنے رب کے نزدیک ان سے زیادہ کم مرتبہ نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے (1): وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ الآیۃ نازل فرمایا: زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، مجاہد، قتادہ اور ضحاک نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے اور جواب محذوف ہے اس کی تقدیر لکان ھذا القران ہے، لیکن اسے ایجازاً حذف کر دیا گیا کیونکہ کلام کے ظاہر میں اس پر دلالت موجود تھی۔

جس طرح امرؤ القیس نے کہا:

فلوأنّها نفسٌ تموتُ جميعةً ولٰكنّها نفسٌ تَسَاقَطُ أنفُسا

اس سے مراد ہے کہ لھان علیّ یہ حضرت قتادہ کے قول کا معنی ہے، آپ نے کہا: اگر تمہارے قرآن سے پہلے کسی قرآن

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 357

نے ایسا کیا ہے تو تمہارا قرآن بھی ضرور ایسا کرے گا۔ ایک قول یہ ہے: اس کا جواب مقدم ہے، اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی وھم یکفرون بالرحمن لو أنزلنا القرآن وفعلنا بھم ما اقترحوا۔ فرا نے کہا: جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "اگر قرآن ان کے ساتھ یہ بھی کر دیتا تو بھی وہ رحمن کا انکار کرتے"۔ زجاج نے کہا: وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سے لے کر الموتی تک پڑھنے کے بعد جواب ہے لما آمنوا کہ تب بھی وہ ایمان نہ لاتے یہاں تو مضمر جواب وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَاۤ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ سے لے کر مَا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ (انعام: 111) تک کے ارشاد سے زیادہ ظاہر ہے۔ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِیْعًا یعنی وہ تمام امور کا مالک ہے، اس میں سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو تم چاہتے ہو یہ قرآن کے ذریعے نہیں ہوگا بلکہ الله کے امر کے ذریعے ہوگا۔

قولہ تعالیٰ: اَفَلَمْ یَایْـَٔسِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا، فراء نے کہا کہ کلبی نے کہا ہے: نخع کی لغت یہ ہے کہ ییئس بمعنی یعلم ہے اس کو قشیری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے؛ یعنی أفلم یعلموا جوہری نے "الصحاح" میں بھی یہی بیان کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یہ ہوازن کی لغت ہے؛ یعنی أفلم یعلم؛ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور حسن سے بھی مروی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا: أفلم یعلموا و یتبینوا یعنی کیا وہ نہیں جانتے اور ان کو واضح نہیں ہوا، اس سلسلہ میں ابو عبیدہ نے مالک بن عوف نصری کا شعر پڑھا ہے:

أَقُولُ لَهُمْ بالشِّعْبِ إِذْ يَيْسِرُونَنِي أَلَمْ تَيْأَسُوا أَنِّي ابنُ فارِسِ زَهْدَمِ(1)

أَلَمْ تَيْأَسُوا شعر میں بھی أَلَمْ یعلموا کے معنی میں ہے۔

ییسروننی، میسر سے ہے سورۂ "بقرۃ" میں یہ گزر چکا ہے اور یاسرونی کا الأسر سے مشتق ہونا بھی مروی ہے۔ رجاح بن عدی نے کہا:

أَلَمْ يَيْئَسِ الأَقْوامُ أَنِّي أَنا ابنُهُ وإِنْ كنتُ عن أرضِ العَشِيرةِ نائيًا

یہاں بھی اَفَلَمْ یَایْـَٔسِ بمعنی أَلَمْ یعلم ہے۔ اور کتاب الرد میں أنی أنا ابنہ ہے۔ غزنوی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے: یعنی ألم یعلم معنی یہ ہوگا: کیا نہیں جانتے ایمان والے کہ اگر الله تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو بغیر ان کے نشانیاں دیکھنے کے ہدایت دے دیتا۔ ایک قول یہ ہے: یہ یأس جو کہ معروف ہے اسی سے ہے، یعنی کیا ایمان والے ان کافروں کے ایمان سے مایوس نہیں ہوئے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر الله تعالیٰ انہیں ہدایت دینا چاہتا تو ہدایت دے دیتا، کیونکہ مومنین نے کفار کے ایمان میں طمع کرتے ہوئے نزول آیات کی تمنا کی۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے: أفلم یتبین الذین آمنوا پڑھا ہے جو کہ "البیان" سے ہے۔ قشیری نے کہا: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہا گیا کہ لکھا ہوا تو اَفَلَمْ یَایْـَٔسْ ہے آپ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ کاتب نے اسے لکھا تو وہ اونگھ کی حالت میں تھا، یعنی اس نے کچھ حروف زیادہ کر دیے حتیٰ کہ یَایْـَٔسْ ہو گیا۔ ابو بکر انباری نے کہا: عکرمہ نے ابن ابی نجیح سے روایت کیا ہے کہ اس نے أفلم یتبین الذین آمنوا پڑھا ہے۔ اور جس نے اس کی تلاوت میں درست سمجھا اس نے اس سے ہی استدلال کیا ہے اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے باطل ہے، کیونکہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 530

مجاہد اور سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ہے۔ پھر اس کا معنی: اَفَلَمْ يَتَبَيَّنِ ہے، پس اگر اللہ کی مراد اس لفظ کے تحت ہے جس کے ذریعے انہوں نے اجماع کی مخالفت کی ہے تو ہماری قرأت اس پر واقع ہوگی اور اس کی تاویل آئے گی اور اگر اللہ تعالیٰ نے وہ دوسرا معنی مراد لیا ہے جس میں یأس ہے جو علم کے طریق سے نہیں تو جو اعتراض انہوں نے کیا ہے وہ ساقط ہو گیا، اور جہاں تک اس کے سقوط کا تعلق ہے تو یہ قرآن کو باطل کر دیتا ہے اور قرآن والوں پر بہتان لازم آتا ہے۔ اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ، اَنْ مخففہ من المثقلہ ہے۔ یعنی اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ، لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا یہ قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ یعنی مصیبت جو ان کو ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے پریشان کرے گی، جب کسی کو مصیبت لاحق ہو تو قرعہ أمرٌ کہا جاتا ہے، اس کی جمع قوارع ہے اور قرع میں اصل ضرب المثل ہوتی ہے شاعر نے کہا:

أَفْنَى تِلَادِي وَمَا جَمَّعْتُ مِن نَشَبٍ قَرْعُ القَوَاقِيزِ أَفْوَاهَ الأَبَارِيقِ

یعنی کفار اس حالت میں رہیں گے کہ جس طرح مشرکین کے سرداروں کو استہزاء کی وجہ سے عذاب نے پکڑا تھا اسی طرح ان کو بھی بجلی کی کڑک سے ہلاک کر دینے والی مصیبت و صدمہ پہنچتا رہے گا جس طرح اربد کو لاحق ہوا تھا اسی طرح قتل، قید، قحط سالی یا اس کے علاوہ عذاب و آزمائش کی صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی صدمہ انہیں ملتا رہے گا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہوئے کہا: القارعة کا معنی النكبة یعنی مصیبت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ نے یہ بھی کہا ہے: القارعة سے مراد وہ جنگیں اور سرایا ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے بھیج دیئے تھے۔ اَوْ تَحُلُّ یا مصیبت اترتی رہے گی قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ یہ حضرت قتادہ اور حسن کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: أو تحل أنت قريبا من دارهم۔ ایک قول یہ ہے: آیت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے، یعنی ان پر مصیبت نازل ہوتی رہے گی پس وہ ان کے صحن میں یا ان کے بالکل قریب نازل ہوئی جس طرح مدینہ اور مکہ کے گاؤں ہیں۔ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ یعنی فتح مکہ میں، یہ حضرت مجاہد و قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ مکہ میں نازل ہوئی، یعنی ان پر مصیبت نازل ہوتی رہے گی، اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے پاس سے نکل کر مدینہ چلے جائیں گے، تو یہ مصیبت ان کے گھروں کے قریب یا ان کا محاصرہ کرتے ہوئے اترے گی اور یہ محاصرہ اہل طائف کا اور خیبر کے قلعہ کا تھا اور آپ کے پاس ان کے ساتھ جنگ اور سختی کرنے کی اجازت کے ذریعے اللہ کا وعدہ آ جائے گا۔ حضرت حسن نے کہا: اللہ کے وعدہ سے مراد قیامت کا دن ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ

فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

''اور بے شک تمسخر اڑایا گیا رسولوں کا جو آپ سے پہلے گزرے پس میں نے ڈھیل دی کافروں کو (کچھ عرصہ تک) پھر میں نے پکڑ لیا انہیں تو (دیکھو) کیسا (بھیانک) تھا میرا عذاب۔ کیا وہ جو نگہبانی فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے اعمال (نیک و بد) کے ساتھ (ان کے بتوں جیسا ہے؟ ہرگز نہیں) اور ان مشرکین نے بنا لیے ہیں اللہ تعالیٰ کے شریک۔ فرمائیے: ذرا نام تو لو ان کا (نادانو!) کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو ایسی بات سے جسے وہ (ہمہ دان) ساری زمین میں نہیں جانتا یا یونہی یاوہ گوئی کر رہے ہو، بلکہ آراستہ کر دیا گیا ہے کافروں کے لیے ان کے مکر و فریب اور روک دیئے گئے ہیں راہ (راست) سے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ ان (بدبختوں) کے لیے عذاب ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بڑا سخت ہوگا اور نہیں ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی بچانے والا''۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ۔ الاستهزاء کا معنی سورۂ ''بقرہ'' میں اور الاملاء کا معنی ''آل عمران'' میں گزر چکا ہے، یعنی ان کا تمسخر اڑایا گیا اور ان کے ساتھ زیادتی کی گئی، پس میں نے کافروں کو کچھ مدت مہلت دی تاکہ جو میرے علم میں تھے کہ ایمان لائیں گے وہ ایمان لے آئیں، جب قضاء پوری ہوئی تو میں نے عقوبت کے ذریعے انہیں پکڑ لیا۔ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ یعنی آپ نے کیسا دیکھا جو میں نے ان کے ساتھ کیا؟، پس آپ کی قوم کے مشرکین کے ساتھ بھی میں اسی طرح کروں گا۔

قولہ تعالیٰ: اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ یہ قیام وہ نہیں جو قعود کی ضد ہوتا ہے بلکہ مخلوق کے امور کی ولایت کے معنی میں ہے، جس طرح کہا جاتا ہے: قام فلان بشغل کذا، فانه قائم علی کل نفس بما کسبت یعنی وہ ہر نفس کے اعمال کی نگہبانی کرتا ہے، اسے پیدا کرتا ہے، اسے رزق دیتا ہے، اس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے عمل پر اسے جزا دیتا ہے، معنی یہ ہوگا کہ وہ ایسا حفاظت کرنے والا ہے جو غافل نہیں ہوتا، جواب محذوف ہے۔ مطلب یہ ہوگا: کیا غافل نہ ہونے والا نگہبان اس کی طرح ہے جو غافل ہوتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ میں قَآئِمٌ کا معنی عالم جاننے والا ہے۔ یہ اعمش کا قول ہے۔

شاعر نے کہا:

فلولا رجالٌ من قريش أعزة سرقتم ثياب البيت والله قائمٌ

اللہ جانتا ہے کہ اگر قریش کے سرداروں کا تجھے خوف نہ ہوتا تو تم بیت اللہ کا غلاف بھی چرا لیتے۔

واللہ قائم یعنی واللہ عالم، پس اللہ تعالیٰ ہر نفس کے اعمال کو جاننے والا ہے۔ ایک قول کے مطابق ضحاک کے نزدیک: اس سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو بنی آدم کے موکل ہیں وَجَعَلُوْا حال ہے، یعنی لقد جعلوا یا اسْتُهْزِئَ پر عطف ہے یعنی استهزئ

وَجَعَلُوْا، یعنی انہوں نے نام رکھ دیا لِلّٰہِ شُرَكَآءَ جو اللہ کے شریک ہیں، شُرَكَآءَ سے مراد وہ بت ہیں جن کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے۔ قُلْ سَمُّوْهُمْ یعنی اے محمد! آپ ان کو فرمایئے: سَمُّوْهُمْ یعنی ان کے نام تو بیان کرو، یہ دھمکی کے طور پر ہے، یعنی انہوں نے نام بھی رکھے ہوئے ہیں: لات، عزّیٰ، مناۃ اور ہبل وغیرہ۔ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ۔ اَمْ استفہامیہ بطور توبیخ ہے یعنی کیا تم اسے آگاہ کرتے ہو۔ درحقیقت یہ گزشتہ استفہام پر عطف معنوی ہے، کیونکہ سَمُّوْهُمْ کا معنی ہے أَنْبِهُ أَسْمَاءَ الخَالِقِينَ۔ اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی الْاَرْضِ؟ ایک قول یہ بھی ہے: معنی یہ ہے کہ آپ ان کو فرمایئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو کسی باطنی بات سے آگاہ کرنا چاہتے ہو جسے وہ نہیں جانتا یا ظاہری قول کی بات کرتے ہو جسے وہ جانتا ہے، اگر وہ کہیں کہ باطن کے متعلق جس کو وہ نہیں جانتا تو یہ محال ہے اور اگر وہ کہیں ظاہر کی بات ہے جسے وہ جانتا ہے تو آپ انہیں فرمایئے: ان کے نام تو بتاؤ، پھر اگر وہ لات وعزّیٰ کا نام لیں تو آپ انہیں فرمائیں: اللہ تو اپنے لیے کسی کو شریک نہیں جانتا۔ ایک قول کے مطابق: اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ کا عطف اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ پر ہے یعنی کیا وہ جو نگہبان ہے یا تم اللہ تعالیٰ کو ایسی چیز سے آگاہ کرنا چاہتے ہو جس کو وہ نہیں جانتا، یعنی تم اللہ کا شریک بناتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے لیے کسی شریک کو نہیں جانتا، کیا تم اسے زمین میں اپنے کسی شریک سے آگاہ کرتے ہو حالانکہ وہ اسے نہیں جانتا؟ اور زمین میں شریک کے ہونے کی نفی اس لیے کی ہے کہ زمین کے علاوہ کسی اور مقام پر تو اس کا کوئی شریک ہے ہی نہیں کیونکہ مشرکین نے زمین میں ہی اس کے شرکاء کا دعویٰ کیا ہے۔ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ کا معنی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انبیاء پر نازل فرمایا۔ حضرت قتادہ نے کہا: اس کا معنی باطل ہے، اسی سے شاعر کا قول ہے:

أَعَيَّرْتَنَا أَلْبَانَهَا وَلُحُومَهَا وَذَالِكَ عَارٌ يَا بن رَيطَةَ ظَاهِرُ

عار ظاهر سے مراد باطل ہے۔ ضحاک نے کہا: اس سے مراد بکذب من القول یعنی یاوہ گوئی ہے۔ اور پانچواں احتمال یہ بھی ہوسکتا ہے بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ایک ایسی محبت ہوگی جس کو وہ اپنی گفتگو کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں اور کلام کا معنی یہ ہوگا: کیا تم اسے اس کی خبر مشاہدہ کر کے دیتے ہو یا بطور دلیل تم یہ بات کرتے ہو: بَلْ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ یعنی اس کو چھوڑیئے، بلکہ کافروں کے لیے ان کا مکروفریب آراستہ کر دیا گیا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس طریقے سے یہ استدراک ہے، یعنی اللہ کا کوئی شریک نہیں، لیکن کافروں کے لیے ان کا مکروفریب آراستہ کر دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے بَلْ زَيَّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرَهُمْ پڑھا ہے یعنی فعل مجہول کے بجائے فعل معروف۔ اور جماعت کی قرات کے مطابق جس ذات نے کافروں کے لیے ان کے مکروفریب کو آراستہ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ایک قول کے مطابق: وہ شیطان ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کفر کو ہی مکر کہہ دیا گیا ہو، کیونکہ رسول کے ساتھ ان کا مکر کفر ہی تھا۔ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِیْلِ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں راہ (راست) سے روک دیا، یہ حمزہ اور کسائی کی قرات ہے جبکہ باقیوں نے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے یعنی صَدُّوا ابوحاتم نے بھی اللہ تعالیٰ کے دیگر ارشادات کی وجہ سے اسے ہی اختیار کیا ہے جیسے وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'' (الاعراف: 86) اور هُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (الفتح: 25) اور زین اور صدوا میں ضمہ کی قرات بھی عمدہ ہے کیونکہ اہل سنت کے مذہب میں یہ معلوم بات ہے کہ اس کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے؛ تو اس آیت میں قدر کا اثبات ہے یہی ابو

عبید کا مختار ہے۔ یحییٰ بن وثاب اور علقمہ نے اسے صِدُّوا صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رِدَّتْ اِلَیْنَا میں رِدَّتْ کو را کے کسرہ کے ساتھ مجہول پڑھا ہے۔ ان کی اصل صُدِدُوا اور رُدِدَتْ ہے، جب پہلی دال کا دوسری دال میں ادغام کیا گیا تو اس کی حرکت ماقبل کو دی گئی تو پہلے حرف پر کسرہ آ گیا۔ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ یعنی اس کی ذلت و رسوائی کے ذریعے فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ هَادٍ سے مراد توفیق دینے والا ہے۔ اس صورت میں کوفیوں اور ان کے متبعین کی قرات کا ثبوت ہے، اس کی دلیل اللہ کا ارشاد وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ اور وَ صُدُّوْا ہے، جبکہ بڑے بڑے قراء بغیر یا کے دال پر وقف کرتے ہیں، اسی طرح والٍ اور واقٍ وغیرہ کیونکہ آپ کسی آدمی کے بارے میں کہتے ہیں: هذا قاضٍ و والٍ وهادٍ تو آپ یا کو اس کے ساکن ہونے اور تنوین کے ساتھ التقاء کی وجہ سے حذف کر دیتے ہیں۔ اس کو فماله من هادی و والی و واقی یا کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یہ ان لوگوں کی لغت کے مطابق ہو گا جو هذا داعی و والی و واقی یا کے ساتھ پڑھتے ہیں، کیونکہ یا کا حذف تو حالت وصل میں تنوین کے ساتھ التقاء ساکنین کی وجہ سے ہوتا ہے، اور ہماری یہ قرات وقف کی صورت میں ہے، لہٰذا یا واپس لوٹ آئے گی تو هادی، والی اور واقی ہو جائے گا۔ خلیل نے قاضٍ کی ندا کے بارے میں: یا قاضی یا کو ثابت رکھ کے کہا ہے، کیونکہ نداء کی صورت میں تنوین نہیں آتی جس طرح الداعی اور المتعالی کی صورت میں تنوین نہیں آتی۔

قولہ تعالیٰ: لَهُمْ عَذَابٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی راہ راست سے روکے ہوئے مشرکین کے لیے دنیا میں قتل، قید و بند اور اس کے علاوہ بیماریوں اور مصائب کی صورت میں عذاب ہے۔ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ یعنی اشد زیادہ سخت، جس طرح آپ کا قول: شقّ علیّ كذا یشقّ۔ وَ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ یعنی کوئی ایسا مانع نہیں جو انہیں اس کے عذاب سے بچا سکے اور نہ ہی کوئی دفاع کرنے والا ہے۔ اور مِن زائدہ ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ وَّ ظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّ عُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ ۳۵

"اس جنت کی کیفیت جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے ایسی ہے کہ رواں ہیں اس کے نیچے ندیاں، اس کا پھل ہمیشہ رہتا ہے اور اس کا سایہ بھی نہیں ڈھلتا، یہ انجام ہے ان کا جو (اپنے رب سے) ڈرتے رہے اور کفار کا انجام آگ ہے"۔

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ، مَثَلُ کے رفع میں نحویوں کا اختلاف ہے۔ سیبویہ نے کہا: مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے یعنی فیما یتلی علیکم مثل الجنة۔ خلیل نے کہا: مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، جبکہ اس کی خبر تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ہے یعنی صفة الجنة التی وعد المتقون تجری من تحتها الانهار، جس طرح کہ تیرا قول: قولی یَقُوْمُ زَیْدٌ میں قولی مبتدا ہے اور یَقُوْمُ زَیْدٌ اس کی خبر، اور مَثَلُ بمعنی صفت تو موجود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۖۛ وَ مَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ (الفتح: 29) مَثَلُهُم سے مراد صِفَتهم ہے۔ اور وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى (النحل: 60) یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے صفت علیا ہے، ابوعلی نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے: مثل بمعنی صفت سنا ہی نہیں گیا،

اس کا معنی شبہ ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اسے اس کی جگہوں اور متصرفات میں استعمال کیا جاتا ہے جیسے عربوں کا قول: مررت برجل مثلك اور یوں بھی کیا جاتا ہے: مررت برجل شبهك اور معنی کے اعتبار سے بھی یہ درست نہیں کیونکہ مثل کا معنی جب صفت لیا جائے گا تو تقدیر کلام ہوگا: صفة الجنة التي فيها أنهار۔

اس کی جنت کی صفت جس میں نہریں ہیں، تو یہ معنی درست نہیں، کیونکہ جنت میں انہار بذات خود ہیں جنت کی صفت نہیں۔ زجاج نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہم سے غیب چیز کی مثال ایسی چیز کے ساتھ بیان فرمائی جس کو ہم دیکھتے ہیں، معنی یہ ہوگا کہ جنت کی مثال ایسی جنت (باغ) کی طرح ہے جس کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ ابو علی نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا: اس قول کے مطابق مثل یا صفت ہوگی یا شبہ، تو ان دونوں صورتوں میں جو کچھ کہا گیا وہ درست نہیں، کیونکہ اگر یہ بمعنی صفت ہو تب بھی صحیح نہیں کیونکہ جب آپ ، ؛ صفة الجنة جنة کہیں گے تو آپ نے جنة کو خبر بنا دیا جو کہ درست نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ الجنة صفت نہیں ہوتی، اسی طرح جنت کی شبہ جنت بھی نہیں ہوتی، آپ نہیں دیکھتے کہ شبہ تو دو متماثل چیزوں کے درمیان پائی جانے والی مماثلت ہوتی ہے تو یہ حدث ہے جب کہ جنت تو حدث نہیں، وہ تو پہلی اور دوسری نہیں ہوتی۔ فراء نے کہا: المثل صرف تاکید کے لیے ہے، اور معنی ہوگا: الْجَنَّةُ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۭ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ اور عرب مَثَلُ کے ذریعے ایسا اکثر کرتے ہیں جس طرح اللہ کا ارشاد: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوریٰ: 11) یعنی لیس هو كشیٔ ایک قول کے مطابق تقدیر پر کلام ہی صفة الجنة التي وعد المتقون۔ صفة جنة، تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ایک قول کے مطابق اس کا معنی ہے: اس جنت کا حسن، نعمت اور ہمیشہ رہنے میں مشابہت جس کا پرہیزگاروں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے، اسی طرح ہے جس طرح دوزخ کا عذاب، شدت اور ہمیشہ رہنے میں مشابہت ہے۔ یہ مقاتل کا قول ہے، أُكُلُهَا دَائِمٌ ختم نہیں ہوتا، حدیث میں ہے: ''جب ایک کھجور لے لی جائے گی تو اس کی جگہ دوسری آجائے گی''۔ ہم (قرطبی) نے اسے ''التذکرہ'' میں بیان کر دیا ہے۔ وَّظِلُّهَا یعنی اس کا سایہ بھی اسی طرح ہے۔ اس کو حذف کر دیا گیا ہے، یعنی اس کا پھل ختم نہیں ہوتا اور اس کا سایہ زائل نہیں ہوتا۔ یہ جہمی فرقے کا رد ہے جن کا خیال یہ ہے کہ جنت کی نعمت زائل بھی ہوتی ہے اور فنا بھی۔ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوا ۖ وَّعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ یعنی مکذبین کے معاملے کی عاقبت اور ان کی آخرت دوزخ ہے جس میں وہ داخل ہوں گے۔

وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ ۖ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَن يُنكِرُ بَعْضَهُ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ ﴿٣٦﴾

''اور جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ خوش ہو رہے ہیں اس کتاب پر جو نازل کی گئی آپ کی طرف اور ان لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں جو بعض قرآن کا انکار کرتے ہیں، فرما دیجئے: (مجھے تمہاری مخالفت کی پرواہ نہیں) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں، اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ یعنی بعض اہل کتاب قرآن کی وجہ سے خوش ہو رہے ہیں

جس طرح ابن سلام اور سلمان، اور وہ لوگ جو حبشہ سے آئے، لفظ عام ہے جب کہ مراد مخصوص۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو قرآن کے نور سے خوش ہوتے ہیں (1)۔ مجاہد اور ابن زید کا بھی یہی قول ہے۔ اور مجاہد سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ اہل کتاب کے مومن ہیں۔ ایک قول یہ ہے: یہ یہود و نصاریٰ میں سے اہل کتاب کی ایک جماعت ہے جو نزول قرآن کی وجہ سے اس لیے خوش ہیں کہ یہ ان کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اکثر علماء نے کہا: ابتدائی نزول میں قرآن میں الرحمٰن کا ذکر کم تھا، جب حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے دوستوں نے اسلام قبول کیا تو قرآن میں الرحمٰن کے ذکر کی کمی انہیں اچھی نہ لگی کیونکہ تورات میں ان کا ذکر زیادہ تھا۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا، تو اللہ نے: قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (الاسراء: 110) کا ارشاد نازل فرمایا۔ قریش نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہوا دعوت تو ایک معبود کی طرف دیتا ہے تو آج اس نے دو معبودوں کی دعوت دینا شروع کر دی، ایک اللہ اور ایک الرحمٰن، اللہ کی قسم! ہم تو سوائے یمامہ کے رحمٰن کے کسی اور کو نہیں جانتے یمامہ کے رحمٰن سے ان کی مراد مسیلمۃ کذاب تھی، تو یہ آیت نازل ہوئیں: وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۳۶ (الانبیاء) وَ هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (الرعد: 30) تو اہل کتاب رحمٰن کے ذکر کی وجہ سے خوش ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے: وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ کا ارشاد نازل فرمایا۔

وَ مِنَ الْاَحْزَابِ یعنی مشرکین مکہ، اور یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں میں سے جو ایمان نہ لائے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد وہ عرب ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد لے کر آتے رہے۔ ایک قول یہ ہے: مسلمانوں کے دشمنوں میں سے وہ مراد ہیں جو قرآن کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، چونکہ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔ قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ۔ اُشْرِكَ میں جماعت کی قراءت اعبد پر عطف کی وجہ سے نصب دی ہے۔ ابو خالد نے جملہ مستانفہ کی حیثیت سے اس کو مرفوع پڑھا ہے، یعنی میں عبادت کے سلسلہ میں اسے یکتا مانتا ہوں کوئی اس کا شریک نہیں اور مشرکین سے جس نے المسیح بن اللہ، عزیر بن اللہ کہا اور یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھنے والے سے بیزار ہوں۔ اِلَیْهِ اَدْعُوْا یعنی اس کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہوں وَ اِلَیْهِ مَاٰبِ یعنی اپنے تمام اُمور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا ؕ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا وَاقٍ ۝۳۷

''اور اسی طرح ہم نے اُتارا ہے اسے فیصلہ عربی زبان میں، اور اگر تم پیروی کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آچکا تمہارے پاس صحیح علم تو نہیں ہوگا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کوئی مددگار اور نہ کوئی محافظ''۔

قولہ تعالیٰ: وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِیًّا یعنی جس طرح ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تو بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا

1۔ زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 256

اسی طرح ہم نے اسے عربی زبان میں فیصلہ نازل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت، عربیا، بیان فرمائی کیونکہ اللہ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کو اس حالت میں نازل فرمایا کہ یہ عربی ہے، تو انھیں لوگوں نے اس فیصلے کا بھی انکار کیا۔ ایک قول کے مطابق نظم آیت ہے کہ جس طرح ہم نے رسولوں پر ان کی زبان میں کتابیں نازل کیں اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن کو عربی زبان میں فیصلہ نازل فرمایا، عَرَبِيًّا سے مراد ''عربی زبان میں'' ہے۔ اور حکم سے مراد وہ احکامات ہیں جو اس میں ہیں۔ ایک قول یہ ہے: ''حکم عربی'' سے مراد سارا قرآن ہے کیونکہ یہ حق و باطل میں فرق اور فیصلہ کرتا ہے۔ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کی عبادت اور غیر کعبہ کی طرف متوجہ ہونے میں مشرکین کی خواہشات (کی اگر آپ نے پیروی کی) بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا وَاقٍ یعنی ایسا مددگار جو تیری مدد کرے گا۔ وَّ لَا وَاقٍ جو تمہیں اس کے عذاب سے بچائے گا۔ خطاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد اُمت ہے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً ؕ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝۳۸

''اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لیے بیویاں اور اولاد اور نہیں ممکن کسی رسول کے لیے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر، ہر میعاد کے لیے ایک نوشتہ ہے''۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ازواج مطہرات کے حوالے سے نقطہ چینی کی انھوں نے کہا: ہم اس آدمی کے سوائے بیویوں اور نکاح کے کوئی خواہش نہیں دیکھتے، اگر یہ نبی ہوتا تو امر نبوت اس کو نکاح سے مشغول رکھتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کو حضرت داود و سلیمان علیہما السلام کا معاملہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا: وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّیَّةً ؕ یعنی ہم نے ان کو بشر بنایا اور شہوات دنیا میں جو اللہ نے حلال کیں ان کو وہ پورا کرتے ہیں ان کی تخصیص صرف وحی میں ہے (یعنی ان کے پاس وحی آتی ہے)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت نکاح میں ترغیب پر دلالت کرتی ہے اور اس پر ابھارتی ہے، جبکہ تَبَتُّل یعنی ترک نکاح سے روکتی ہے، اس آیت کے مطابق یہ رسولوں کی سنت ہے اور سنت بھی اس کے معنی پر وارد ہوئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم شادیاں کرو، میں تمہاری وجہ سے دیگر اُمتوں پہ کثرت دکھانے والا ہوں گا'' (1)۔ الحدیث، سورۂ ''آل عمران'' میں یہ گزر چکی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''جس نے شادی کی اس نے نصف دین کی تکمیل چاہی پس اسے دوسرے نصف کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے'' (2)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح زنا سے بچاتا ہے اور پاکدامنی ان دو خصلتوں میں سے ہے جن کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی ضمانت دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کو اللہ تعالیٰ نے دو کے شر سے محفوظ رکھا وہ جنت میں داخل ہو گیا (ایک) جو دو جبڑوں کے درمیان ہے (زبان) اور (دوسرا) جو ٹانگوں کے درمیان ہے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 296، حدیث 4561 2۔ ایضاً

(شرمگاہ)''(1)۔ اس کو مؤطا اور دیگر کتب کے مصنفین نے روایت کیا ہے۔ اور صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: تین آدمیوں کا گروہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے گھروں کی طرف آیا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے متعلق پوچھتے رہے، جب انھیں بتایا گیا تو گویا انھوں نے اپنی عبادت کو کم سمجھا، انھوں نے کہا: ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اگلے پچھلے گناہوں سے محفوظ رکھا، ان میں سے ایک نے کہا: میں ہمیشہ رات کو نماز پڑھوں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ساری زندگی روزہ رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا بس شادی نہیں کروں گا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے آپ نے فرمایا: ''تم وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ، یہ کہا، اللہ تعالیٰ کی قسم! میں تمہیں اللہ سے ڈراتا ہوں اور اس کی پرہیزگاری اختیار کرنے کا حکم دیتا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ میں سے نہیں'' (2)۔ امام مسلم نے اس کو بالمعنی روایت کیا، اور یہ واضح ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے کہا: اگر آپ انہیں اجازت دے دیتے تو ضرور ہم اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔ ''آل عمران'' میں بچے کی طلب پر ابھارنا اور جو اس سے ناواقف ہے اس کی تردید گزر چکی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ فرماتے تھے: میں عورت کے ساتھ شادی کرتا ہوں حالانکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، اور میں اس کے ساتھ وطی کرتا ہیں حالانکہ مجھے اس کی کوئی خواہش نہیں۔ آپ کو کہا گیا: اے امیر المومنین! کون سی چیز آپ کو اس پر ابھارتی ہے؟ آپ نے فرمایا: اس بات کی محبت کہ اللہ تعالیٰ مجھ میں سے وہ اولاد پیدا کرے جس کی وجہ سے قیامت کے دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دیگر انبیاء پر فخر کریں گے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: ''تمہارے اوپر باکرہ عورتوں کے ساتھ شادی کرنا لازم ہے بے شک وہ منہ کے اعتبار سے بہت زیادہ میٹھی، اخلاق کے لحاظ سے بہت زیادہ عمدہ اور بچے پیدا کرنے کے اعتبار سے بہت زیادہ ہوتی ہیں اور میں قیامت کے دن تمہارے ذریعے دیگر اُمتوں پر فخر کروں گا (3)۔'' انتق ارحاما سے آپ نے زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورت مراد لی ہے؛ زیادہ بچے پیدا والی عورت کو ناتق کہا جاتا ہے۔ ابو داؤد نے حضرت معقل بن یسار سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا: ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اس نے کہا: مجھے ایک حسب نسب والی عورت مل رہی ہے لیکن وہ بچے نہیں جنتی، کیا میں اس کے ساتھ شادی کرلوں؟ آپ نے فرمایا: ''نہیں''۔ پھر وہ دوبارہ آپ کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھر منع فرمایا، پھر تیسری مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہت زیادہ بچے پیدا کرنے والی عورت کے ساتھ شادی کرو، میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دیگر اُمتوں پر فخر کروں گا'' (4)۔ ابو محمد عبد الحق نے اس کو صحیح قول قرار دیا ہے۔

1۔ مؤطا امام مالک، کتاب الکلام، ما جاء فیما یخاف من اللسان، جلد 2، صفحہ 988

2۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح، الترغیب فی النکاح، جلد 2، صفحہ 757

3۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 294، حدیث 44549۔ ایضاً سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب تزویج الابکار، حدیث 1850، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 296، حدیث 44561

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ انہوں نے آیات کے نزول کی خواہش کی تھی جس کا ذکر اسی سورت میں ہی گزر چکا ہے۔ دوبارہ اسی کے بارے میں کلام فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا۔ کلام کا ظاہر تو ممانعت پر دلالت کرتا ہے مگر اس کا معنی نفی ہے کیونکہ جس کی کوئی استطاعت ہی نہ رکھتا ہو اس کے حوالے سے اس کو منع نہیں کیا جاسکتا۔ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ یعنی ہر وہ کام جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا وہ اللہ کے ہاں لکھا ہوا ہے، یہ حضرت حسن کا قول ہے: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، معنی یہ ہوگا: لکل کِتَاب اَجل یہ فراء اور ضحاک کا قول ہے یعنی ہر کام جس کو اللہ نے لکھ دیا ہے اس کی مدت مقرر اور وقت معلوم ہے، اس کی مثال لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ عذاب کے نازل ہونے میں قوموں کے مطالبے بنیاد نہیں ہوتے بلکہ اس کی بنیاد لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مدت کے لیے لکھی ہوئی کتاب اور امر مقدر ہوتا ہے جس پر فرشتے بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ حکیم ترمذی نے ''نوادر الاصول'' میں شہر بن حوشب عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور سیناء میں ارتقا فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی انگلی میں انگوٹھی ملاحظہ فرمائی تو فرمایا: اے موسیٰ! یہ کیا ہے؟ حالانکہ وہ ان سے زیادہ اس کو جانتا تھا، آپ نے عرض کیا: مرد کے زیورات میں سے ایک چیز ہے، اللہ نے فرمایا: کیا اس پر میرے اسماء یا کلام میں سے کچھ لکھا ہوا ہے؟ آپ نے عرض کیا: نہیں، تو اللہ نے فرمایا: اس پر لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ لکھ دو۔

یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۖۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝۳۹

''مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہتا ہے) اور اُسی کے پاس ہے اصل کتاب''۔

قولہ تعالیٰ: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ یعنی اس کتاب سے جس کو چاہتا ہے وہ اس کے اہل پر واقع ہو اور اس کو پہنچے تو اسے مٹاتا ہے وَ یُثْبِتُ جس کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے یعنی اس کے وقت تک اس کو مؤخر کر دیتا ہے۔ محوتُ الکتاب محوًا کہا جاتا ہے یعنی میں نے اس کا اثر ختم کر دیا۔

وَ یُثْبِتُ یعنی یُثبِتُه جس طرح اللہ کا ارشاد: وَ الذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ (الاحزاب: 35) یعنی والذاکرات اللہ۔

ابن کثیر، ابو عمرو اور عاصم نے وَ یُثْبِتُ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے مشدد پڑھا ہے، یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرات ہے اور زیادہ لوگوں کی قرأت ہونے کی وجہ سے ابو حاتم نے اور ابو عبیدہ نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد دلیل بھی ہے: یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (ابراہیم: 27) ابن عمر نے کہا: میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) باقی رکھتا ہے سوائے سعادت، بدبختی اور موت کے'' (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سوائے چند اشیاء کے جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، تخلیق، اخلاق، موت، رزق، سعادت اور شقاوت۔ آپ ہی سے مروی ہے (2): سوائے ام الکتاب کے یہ دو کتابیں ہیں، ان دونوں میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ وہ جس میں سے کوئی چیز

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 361
2۔ زاد المسیر، سورۂ رعد، جلد 2، صفحہ 259

تبدیل نہیں ہوتی۔ قشیری نے کہا: کہا جاتا ہے کہ سعادت، شقاوت، تخلیق، اخلاق اور رزق میں کوئی تبدیلی نہیں، لہٰذا آیت کریمہ ان چیزوں کے علاوہ کے بارے میں ہے اور اس قسم میں گویا تحکم کی صورت پائی جاتی ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس قسم کی چیزوں کو رائے اور اجتہاد کے ذریعے نہیں جانا جاسکتا بلکہ یہ توقیفی ہوتی ہیں، پس اگر یہ صحیح ہے تو اس کے مطابق قول لازم ہوتا ہے اور اس کے ہاں روک دیا جاتا ہے ورنہ آیت تمام چیزوں کو عام ہوگی، اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ اللہ اعلم۔ اور یہ معنی حضرت عمر بن خطاب، حضرت ابن مسعود، حضرت ابووائل، حضرت کعب احبار اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، اور یہی کلبی کا قول ہے۔ حضرت ابوعثمان نہدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: یا اللہ! اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھ دیا ہے تو مجھے ان میں ثابت رکھ اور اگر اہل شقاوت اور گناہگاروں میں لکھ دیا ہے تو مجھے ان میں سے مٹادے اور اہل سعادت و مغفرت میں لکھ دے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا اللہ! اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھا ہے تو ان میں مجھے باقی رکھو، اور اگر بدبختوں میں لکھا ہے تو مجھے ان میں سے مٹادے اور سعادت مندوں میں لکھ دے، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہے باقی رکھتا ہے، اور تیرے پاس اُمّ الکتاب ہے۔ اور حضرت ابووائل اکثر دعا مانگتے تھے: یا اللہ! اگر تو نے ہمیں بدبختوں میں لکھا ہوا ہے تو مٹادے اور سعادت مندوں میں لکھ دے، اور اگر سعادت مندوں میں لکھا ہوا ہے تو باقی رکھ، بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور باقی رکھتا ہے، حضرت کعب نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کہا: اگر اللہ کی کتاب میں آیت نہ ہوتی تو قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے میں تجھے اس سے ضرور آگاہ کردیتا، آیت سے مراد یَمۡحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ﴿۳۹﴾ حضرت مالک بن دینار نے جس عورت کے متعلق دعا کی تھی (یہی کہا تھا): اے اللہ! اگر اس کے پیٹ میں بچی ہے تو اسے بچے میں تبدیل فرما بے شک تو جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور تیرے پاس اُمُّ الۡکِتٰبِ ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت گزر چکی ہے (1) کہ حضرت ابوہریرہ نے فرمایا: میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: "جس کو یہ بات خوش کرتی ہے کہ اس کے رزق میں وسعت کی جائے اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرے"۔ اسی طرح کی روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی ہے (2) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنۡ اَحَبَّ جس کو یہ بات پسند ہے" باقی حدیث بعینہ وہی ہے یعنی پہلی روایت میں مَنۡ سَرَّہٗ کے الفاظ ہیں جبکہ اس میں مَنۡ اَحَبَّ کے علاوہ باقی الفاظ میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی دو تاویلیں ہیں ایک معنوی تاویل ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اچھی تعریف، عمدہ ذکر اور اجر مکرر میں سے اس کے بعد باقی رہ جائیں گی، تو ایسا ہوگا کہ گویا وہ مرا ہی نہیں۔ اور دوسری تاویل یہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی اجل اور وہ اجل جس کے بارے میں اللہ کے علم میں یہ تھا کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اس کو موخر کردیا جاتا ہے۔ جس طرح اللہ کا ارشاد: یَمۡحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَهٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ہے۔ جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث صحیح روایت کی کہ آپ نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، من بسط فی الرزق، جلد 2، صفحہ 885 2۔ ایضاً

فرمایا: ''جو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی عمر اور اجل لمبی ہو جائے اور اس کے رزق میں اضافہ کر دیا جائے تو وہ اللہ سے ڈرے اور صلہ رحمی کرے'' (1)۔ تو کہا گیا کہ عمر اور اجل میں کیسے اضافہ کیا جاتا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ عزوجل نے فرمایا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (الانعام: 2) وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اجل کا فیصلہ کیا اور اجل اس کے ہاں مقرر ہے۔ پہلی اجل بندے کی وہ اجل ہے جو اس کی ولادت سے لیکر وفات تک ہوتی ہے جب کہ دوسری اجل یعنی جو اللہ کے ہاں مقرر ہے وہ بندے کی وفات سے لیکر اس دن تک ہے جس دن برزخ میں اس کی ملاقات ہوگی اس کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا، جب بندہ تقویٰ اختیار کرے اور صلہ رحمی کرے تو اللہ تعالیٰ بندے کی برزخ کی اجل سے پہلی عمر کی مدت میں جتنا چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے اور اگر وہ نافرمانی کرے اور قطع رحمی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی دنیا میں جتنی چاہتا ہے عمر کم کرتا ہے، اور اس کی برزخی زندگی کی مدت میں اضافہ فرما دیتا ہے۔ اور جب اللہ کے علم میں اس کی سابق اجل حتمی ہو تو پھر زیادتی اور کمی ممتنع ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (الاعراف) یعنی جب اس کی اجل آجائے گی تو نہ ایک لمحہ تاخیر سے آئے گی اور نہ ہی پہلے۔ پس اس طرح حدیث اور آیت میں مطابقت ہوگئی۔ اور یہی نفس عمر اور اجل میں ظاہری لفظوں کے اعتبار سے اضافہ ہے اس کو حبر الأمة نے اختیار کیا ہے، واللہ اعلم۔ مجاہد نے کہا: اللہ تعالیٰ سال کے معاملات کا رمضان المبارک میں قطعی فیصلہ فرما دیتا ہے پس جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے سوائے زندگی و موت، اور شقاوت و سعادت کے، اس کے بارے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ ضحاک نے کہا: اللہ تعالیٰ کراماً کاتبین کے رجسٹروں سے ایسے امور جن کی کوئی ثواب و سزا نہیں ہوتی ان میں جن کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جن میں ثواب وعقاب ہوتا ہے ان کو باقی رکھتا ہے، اس کا معنی ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ کلبی نے کہا: رزق میں سے مٹاتا ہے اور اضافہ کرتا ہے، اور اجل میں سے مٹاتا ہے اور اضافہ کرتا ہے، اور انہوں نے اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ پھر کلبی سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: وہ ساری کی ساری باتیں لکھتا ہے یہاں تک کہ جب جمعرات کا دن آتا ہے تو اس میں سے ہر اس چیز کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے جس میں ثواب وعقاب نہیں ہوتا، جیسے مثلاً تمہارا قول: میں نے کھایا، میں نے پیا، میں داخل ہوا اور میں نکلا وغیرہ اور اس گفتگو میں بندہ سچا بھی ہو، اور جن میں ثواب وعقاب ہوتا ہے ان کو باقی رکھتا ہے۔ حضرت قتادہ، ابن زید اور سعید بن جبیر نے کہا: اللہ تعالیٰ فرائض ونوافل میں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے پس انہیں منسوخ کر دیتا ہے اور بدل دیتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے ان کو منسوخ نہیں کرتا، اور جملہ ناسخ ومنسوخ اس کے ہاں ام الکتاب میں ہیں۔ نحاس اور مہدوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس طرح روایت کیا ہے، نحاس نے کہا: حدثنا بکر بن سہل قال حدثنا ابو صالح عن معاویہ بن صالح عن علی بن أبي طلحہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ قرآن سے جو چاہتا ہے تبدیل کر دیتا ہے اور اسے منسوخ کر دیتا ہے۔ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ یعنی اسے تبدیل نہیں کرتا، وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ آپ فرماتے ہیں: ناسخ ومنسوخ سب اس کے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 475

ہاں اُمّ الکتاب میں ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا: یمحو ما یشاء یعنی یغفر ما یشاء ہے یعنی اپنے بندوں کے گناہوں میں سے جو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور یثبت ما یشاء یعنی یترک ما یشاء یعنی جو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے اور معاف نہیں کرتا۔ عکرمہ نے کہا: یمحو ما یشاء و یثبت یعنی توبہ کے ذریعے تمام گناہوں کو مٹاتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں لکھ دیتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا آیۃ (الفرقان: 70) حضرت حسن نے فرمایا: یمحو ما یشاء یعنی جس کی اجل آجائے اسے مٹا دیتا ہے وَ یُثْبِتُ اور جس کی اجل نہ آئے اسے باقی رکھتا ہے۔ اور حضرت حسن ہی نے کہا: اباء کو مٹاتا ہے اور ابناء کو باقی رکھتا ہے۔ اور آپ ہی سے مروی ہے: کراماً کاتبین کو گناہوں میں سے کچھ بھلا دیے جاتے ہیں اور کچھ نہیں بھلائے جاتے۔ سدی نے کہا (1): یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ یعنی چاند کو مٹاتا ہے وَ یُثْبِتُ اور سورج کو باقی رکھتا ہے، اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: فَمَحَوْنَاۤ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَاۤ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً (الاسراء: 12) پس ہم نے رات کی نشانی کو مٹایا اور دن کی نشانی کو دکھائی دینے والا بنایا۔ حضرت ربیع بن انس نے کہا: یہ نیند کی حالت میں ارواح کے حوالے سے ہے، نیند کے وقت وہ اس پر قبضہ کرتا ہے، پھر جب اچانک اس کی موت کا ارادہ کرتا ہے تو اسے روک لیتا ہے، اور جس کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس کو ثابت رکھتا ہے اور اسے اپنے صاحب کی طرف لوٹا دیتا ہے۔ اس کا بیان اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے: اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا الایۃ (الزمر: 42) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نسلوں اور قوموں میں سے جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد: اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ (یٰسٓ: 31) کیا انہوں نے نہیں دیکھا ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور ان میں جن کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد گرامی: ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ﴿۳۱﴾ (المومنون) پھر ہم نے ان کے بعد دوسری قوم کو پیدا کر دیا۔

پس ایک نسل کو مٹاتا ہے اور دوسری نسل کو ثابت رکھتا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے مراد وہ آدمی ہے جو عرصہ دراز تک اللہ کی اطاعت پر کاربند رہتا ہے پھر اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور گمراہی پر ہی مر جاتا ہے، پس یہی ہے جس کو وہ مٹاتا ہے اور جو باقی رہتا ہے اس سے مراد وہ آدمی ہے جو طویل عرصہ تک اللہ کی نافرمانی پر ہی عمل کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ گناہوں کے رجسٹر سے اسے مٹاتا ہے اور نیکیوں کے رجسٹر میں اسے باقی رکھتا ہے، ثعلبی اور ماوردی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے۔ ایک قول کے مطابق: یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ سے مراد دنیا اور یُثْبِتُ سے مراد آخرت ہے۔ قیس بن عباد نے رجب کے دسویں دن کہا: یہی وہ دن ہے جس میں اللہ جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے؛ جبکہ مجاہد سے مروی روایت گزر چکی ہے کہ یہ رمضان میں ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی سفید پتھر سے بنی ہوئی ایک لوح محفوظ ہے جس کی مسافت پانچ سو سال کی ہے، سیاہ یاقوت کی اس کی دو جلدیں ہیں، اللہ تعالیٰ ہر روز تین سو ستر مرتبہ اسے دیکھتا ہے، جس کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب رات کی تین ساعتیں باقی ہوتی ہیں تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ ”الذکر“ کو کھولتا ہے، اس

1۔ معالم التنزیل، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 362

کتاب کو دیکھتا ہے جس کو اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا پس جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے''۔ اور عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا، تو یہ مٹانا اور ثابت رکھنا ان امور میں ہوتا ہے جن کے بارے میں قضا گزر چکی ہے، اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ قضا میں وہ بھی ہوتی ہے جو حتمی طور پر وقوع پذیر ہوتی ہے تو یہ ثابت ہے اور قضا کی ایک صورت ایسی ہے جو اسباب کے ذریعے وقوع پذیر ہوتی ہے یہ مٹنے والی ہے۔ واللہ اعلم۔ غزنوی نے کہا: میرے نزدیک یہ ہے کہ لوح میں بعض ملائکہ کے احاطہ کر لینے کی وجہ سے جو غیب سے نکل چکی ہو تو وہ تبدیلی کا احتمال رکھتی ہے، کیونکہ مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے سارے علم کا احاطہ کرنا محال ہے اور اشیاء کی تقدیر میں جو اللہ کے علم میں ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ یعنی وہ اصل جن میں آجال وغیرہ لکھی ہوئی ہیں۔ ایک قول یہ ہے: امّ الکتاب سے مراد وہ لوح محفوظ ہے (1) جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ بھی ہے: اس میں بھی تبدیلی جاری رہتی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے: یہ صرف دوسرے جرائد میں جاری رہتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے امّ الکتاب (2) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس کا وہ خالق ہے اور جس کو اس نے پیدا کیا ہے وہ اس کے علم کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے سو اللہ نے اپنے علم کو فرمایا: ''تو کتاب بن جا، اور اللہ کے علم میں کوئی تبدیلی نہیں، اور آپ ہی سے مروی ہے کہ یہ الذکر ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ (الانبیاء: 105) اور ہم نے زبور میں الذکر کے بعد لکھ دیا ہے۔ یہ اس کے معنی کو پہلے کی طرف راجع کرتا ہے اور یہی حضرت کعب کے قول کا معنی ہے۔ حضرت کعب احبار نے فرمایا: اُمُّ الْكِتٰبِ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق اور جن کا وہ خالق ہے کے بارے میں علم ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ۭ وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ۭ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

''اور اگر ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کی ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے (تو ہماری مرضی) یا ہم (پہلے ہی) اٹھا لیں آپ کو (تو ہماری مرضی) سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ (ان سے) حساب لیں۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم (ان کے مقبوضہ) علاقہ کو ہر طرف سے (رفتہ رفتہ) کم کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے کوئی نہیں ردّ و بدل کر سکتا اس کے حکم میں، اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے''۔

قولہ تعالیٰ: وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ ''ما'' زائد ہے، تقدیر عبارت: وان نُرِیَنَّكَ بعضَ الذی نَعِدُھُم ہے اس سے مراد عذاب ہے: دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (رعد: 34) دنیوی زندگی میں ان کے لیے عذاب ہے۔ اور اللہ کا ارشاد ہے: وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ (رعد: 31) یعنی اگر ہم آپ کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 362　　2۔ ایضاً

اس کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ پس آپ پر سوائے ابلاغ یعنی تبلیغ کے کچھ نہیں۔ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ حساب سے مراد جزاء وسزا ہے۔

قولہ تعالیٰ:۔ اَوَ لَمْ یَرَوْا یعنی کیا اہل مکہ نے نہیں دیکھا۔ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ یعنی ہم اس کا قصد کر رہے ہیں۔ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا اس میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد نے کہا: یہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ہے یعنی ان کے علماء وصلحاء کی موت کے ذریعے ہم انہیں کم کر رہے ہیں۔ قشیری نے کہا: اس بنیاد پر اطراف سے مراد اشراف ہیں۔ ابن اعرابی نے کہا: الطَّرَفُ والطَّرْفُ سے مراد کریم آدمی ہے، لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے، کیونکہ آیت کا مقصد یہ ہے: ہم ان کو ان کے معاملات میں نقصان دکھاتے ہیں، تاکہ وہ جان لیں کہ ان سے سزا کی تاخیر عجز کی وجہ سے نہیں۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو یہود و نصاریٰ کے علماء کی موت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ مجاہد، قتادہ اور حسن نے کہا: اس سے مراد مشرکین کے قبضہ میں موجود چیزوں میں سے جن پر مسلمانوں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا وہ ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے مراد بے آباد زمین ہے حتیٰ کہ اس کے ایک کونے میں آبادی ہوتی ہے۔ مجاہد سے مروی ہے: اس کے نقصان سے مراد اس کی خرابی اور اس کے اہل کی موت ہے۔ وکیع بن جراح نے عن طلحہ بن عمیر عن عطاء بن ابی رباح اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کا ذکر کرتے ہوئے کہا: اس سے اس کے فقہاء اور باسیوں میں سے بہترین لوگوں کا جانا مراد ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے کہا: اس آیت کی تاویل میں عطا کا قول بہت عمدہ ہے، اہل علم نے اسے تلقی قبول سے نوازا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس کو مہدوی نے مجاہد اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، اور یہ بذات خود پہلے قول کی نص ہے۔ سفیان نے عن منصور عن مجاہد روایت کیا ہے کہ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا سے مراد فقہاء وعلماء کی موت ہے، اور لغت میں یہ بات معروف ہے کہ الطرف ہر چیز کے بہترین اور کریم حصہ کو کہا گیا ہے۔ اور ابو نصر عبد الرحیم بن عبد الکریم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال میں سے جس قول کو منتخب کیا ہے یہ اس کے برعکس ہے۔ عکرمہ اور شعبی نے کہا: اس سے مراد نقصان اور لوگوں کی موت ہے۔ ان میں سے ایک نے کہا: اگر زمین کم ہوتی تو تجھ پر وضو کرنے کی جگہ تنگ ہو جاتی اور دوسرے نے کہا: تجھ پر وہ جگہیں تنگ ہو جاتیں جن میں تو بول و براز کرتا ہے۔

ایک قول کے مطابق: اس سے مراد قریش سے پہلے ہلاک ہونے والی قوموں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان کی زمینوں کی بربادی ہے، اور معنی یہ ہے: کیا قریش نے اپنے سے پہلے لوگوں کی ہلاکت اور ان کے بعد ان کی زمینوں کی بربادی نہیں دیکھی؟ کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ کہیں ان کے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو جائے؟ یہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور ابن مریم سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس نے زمین کی برکات، اس کے پھل اور اس کے باسیوں کو کم کر دیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے: اس نے اس سرزمین کے حکمرانوں کے ظلم کی وجہ سے اس کو کم کر دیا۔

میں (قرطبی) نے کہا: یہ معنی صحیح ہے، بے شک ظلم وستم شہریوں کے قتل، اس زمین سے ان کے انخلاء اور زمین سے برکت

کے اُٹھ جانے کے سبب شہروں کو برباد کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ:۔ وَ اللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ یعنی کوئی بھی اس کے حکم میں نقص یا تبدیلی کے ذریعے ردوبدل نہیں کر سکتا۔ وَ هُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ یعنی کافروں سے انتقام لینے میں اور مومن کو ثواب عطا کرنے میں وہ بہت جلدی کرتا ہے۔ اور ایک قول کے مطابق: اسے اپنے حساب میں دل کے سوچ بچار اور انگلیوں کے پوروں پر گننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِیْعًا ؕ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَیَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

"اور مکاریاں کرتے رہے وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے، سو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ان سب کو مکر کی سزا دینا وہ جانتا ہے جو کماتا ہے ہر شخص اور عنقریب کفار بھی جان لیں گے کہ دار آخرت (کی ابدی مسرتیں) کس کے لیے ہیں۔ اور کفار کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں، فرمایئے: (میری رسالت پر) اللہ تعالیٰ بطور گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان اور وہ لوگ (بطور گواہ کافی ہیں) جن کے پاس کتاب کا علم ہے"۔

قولہ تعالیٰ:۔ وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی مشرکین مکہ سے پہلے، ان لوگوں نے رسولوں کے ساتھ مکر کیا، ان کے ساتھ فریب کیا اور ان کا انکار کیا۔ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِیْعًا یعنی مکر کرنے والوں کا مکر اسی کا پیدا کردہ ہے، لہٰذا اس کے اذن کے بغیر کوئی نقصان نہیں دیتا۔ ایک قول کے مطابق: فللّٰہ خیر المکر یعنی وہ ان کو اس کی سزا دے گا۔ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ یعنی خیر اور شر میں سے جو کوئی کرتا ہے وہ جانتا ہے پس اس پر وہ سزا دے گا۔ وَ یَعْلَمُ الكافِرُ نافع، ابن کثیر اور ابو عمر کی یہی قرآت ہے جبکہ باقیوں نے الکفار پڑھا ہے۔ ایک قول یہ ہے: اس سے اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کو مراد لیا ہے۔ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ یعنی ثواب وعقاب کے اعتبار سے دار دنیا کا انجام یا یہ مراد ہے کہ دار آخرت میں ثواب وعقاب کس کے لیے ہے، یہ تہدید اور وعید ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا حضرت قتادہ نے کہا (1): یہ عرب کے مشرکین تھے۔ لَسْتَ مُرْسَلًا یعنی تو نہ نبی ہے اور نہ رسول تو صرف جھوٹ بولنے والا ہے (نعوذ باللہ) وہ کسی چیز کا مطالبہ کرتے تو پورا نہ ہونے کی صورت میں یہ کہتے۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرما دیجیے۔ كَفٰى بِاللّٰهِ یعنی کفی اللہ، اللہ کافی ہے۔ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ یعنی میری سچائی اور تمہارے جھوٹ پر بطور گواہ کافی ہے۔ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ یہ مشرکین مکہ کے خلاف بطور حجت ہے، کیونکہ وہ تفاسیر میں اہل کتاب کے ایمانداروں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ایک قول کے مطابق: ان کی گواہی مدمقابل کے قول کے لیے قاطع ہوتی تھی اور وہ اہل کتاب کے مومن ہیں جس طرح حضرت عبداللہ بن سلام، حضرت سلمان فارسی، حضرت تمیم داری، حضرت نجاشی اور اس کے دوست، یہ حضرت قتادہ اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ ترمذی نے حضرت عبداللہ بن سلام سے روایت کیا: جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کی کوشش کی گئی تو حضرت عبداللہ بن سلام آئے

1۔ تفسیر ماوردی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 119

تو حضرت عثمان نے انہیں کہا: کیا لے کے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: میں آپ کی مدد کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کے پاس جاؤ اور انہیں مجھ سے دور کرو، آپ کا باہر ہونا میرے لیے اندر ہونے سے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام لوگوں کے پاس گئے اور کہا: اے لوگو! زمانہ جاہلیت میں میرا نام فلاں تھا، رسول اللہ ﷺ نے میرا نام عبداللہ رکھا، میرے بارے میں کتاب اللہ کی کچھ آیات نازل ہوئی ہیں: وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ عَلٰى مِثۡلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسۡتَكۡبَرۡتُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۝ (الاحقاف)۔ بنی اسرائیل کے ایک گواہ نے اپنے جیسے آدمی کے خلاف گواہی دی، پس وہ ایمان لایا اور تم نے تکبر کیا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ میرے بارے میں نازل ہوئی ہے اور قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًۢا بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ آیت کریمہ میرے متعلق نازل ہوئی ہے۔ الحدیث۔ اور ہم (قرطبی) نے یہ پوری حدیث کتاب ''التذکرہ'' میں لکھ دی ہے۔ اس کے بارے میں ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: ہذا حدیث حسن غریب۔ زمانہ جاہلیت میں آپ کا نام حصین تھا۔ نبی کریم ﷺ نے عبداللہ رکھا۔ ابو بشر نے کہا: میں نے سعید بن جبیر کو کہا: وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ کس کے بارے ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ حضرت عبداللہ بن سلام ہیں (1)۔

میں (قرطبی) نے کہا: حضرت عبداللہ بن سلام کیسے مراد ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ سورت مکی ہے اور حضرت عبداللہ بن سلام نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے؟ ثعلبی نے اس کو ذکر کیا ہے۔ قشیری نے کہا: ابن جبیر نے کہا کہ سورت مکی ہے اور حضرت ابن سلام نے اس سورت کے نزول کے بعد مدینہ میں اسلام قبول کیا، لہٰذا اس آیت کو ابن سلام پر محمول کرنا درست نہیں۔ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ سے جبریل امین مراد ہیں، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت حسن، مجاہد اور ضحاک نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے: اور وہ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ پڑھتے تھے اور جو یہ کہتا کہ یہ حضرت عبداللہ بن سلام اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ہیں اس کا یہ انکار کرتے تھے، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق سورت مکی ہے اور انہوں نے مدینہ میں اسلام قبول کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ پڑھا، اگرچہ روایت میں ضعف ہے۔ اس کو سلیمان بن ارقم نے عن الزہری عن سالم عن ابیہ عن النبی ﷺ روایت کیا ہے اور محبوب نے اسمٰعیل بن محمد یمانی سے روایت کیا ہے آپ نے اسی طرح پڑھا ہے یعنی وَمَنۡ عِنۡدَهٗ میم، عین اور دال کے کسرہ کے ساتھ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ عین کے ضمہ اور کتاب کے رفع کے ساتھ۔ عبداللہ بن عطا نے کہا: میں نے ابو جعفر بن علی بن حسین بن حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو کہا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ صرف حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں، محمد بن حنفیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ایک قول کے مطابق: سارے مومنین مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

قاضی ابو بکر بن عربی نے کہا: جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جس نے کہا ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے، تو اس کو دو صورتوں میں سے کسی ایک پر محمول کیا جائے گا یا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ ان کے نزدیک وہ سب مومنین سے زیادہ عالم ہوں گے جبکہ معاملہ ایسا نہیں، بلکہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ان سے زیادہ عالم تھے یا پھر نبی کریم ﷺ کا

1۔ معالم التنزیل، جلد 3، صفحہ 365۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب و من سورۃ الاحقاف، حدیث نمبر 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ارشاد أنا مدينة العلم وعلی بابها(1) کی وجہ سے تو یہ روایت باطل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم علم کا شہر ہیں اور آپ کے صحابہ اس کے دروازے، علوم میں قدر و منزلت کے مطابق ان میں سے کچھ کھلے دروازے ہیں اور کچھ درمیانی درجے کے البتہ جس نے کہا ہے کہ سارے مومنین مراد ہیں اس نے صحیح کہا، کیونکہ ہر مومن کتاب کو جانتا ہے، اس کے اعجاز کی وجہ کا ادراک رکھتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

میں (قرطبی) نے کہا: اس بنیاد پر کتاب سے مراد قرآن ہے۔ اور جہاں تک اس آدمی کا تعلق ہے جس نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو مراد لیا ہے اس نے ترمذی کی حدیث پر بھروسہ کیا ہے، اور یہ ممتنع نہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں کوئی بات نازل ہوئی ہو اور مراد سارے مومنین ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ذکر سب کافروں کا ہے اور مراد قریش ہیں، پس جن کے پاس کتاب کا علم ہے وہ یہود و نصاریٰ کے مومنین ہو سکتے ہیں یعنی وہ لوگ وہ ہیں جو بتوں کی پوجا کرنے والوں کی نسبت نبوت اور کتاب کی معرفت کے زیادہ قریب ہیں۔ نحاس نے کہا: اور جس آدمی نے کہا کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور دیگر ہیں تو اس کی بات کا احتمال بھی ہے کیونکہ جب دلائل بھی صحیح ہوں اور یہ بھی معروف ہو کہ نزول قرآن سے پہلے وہ کتابوں کو پڑھتے تھے تو بات اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت کو بہتر جانتا ہے۔

1۔ احکام القرآن لابن العربی، سورۂ رعد، جلد 3، صفحہ 1114